جمہوریت : ایک تعارف | ایمن بٹلر

جمہوریت کی تفہیم

جمہوریت کی تاریخ

جمہوری ادارے

جمہوریت کے اصول

آج کی نمائندہ جمہوریتیں

جمہوریت کے فوائد

جمہوریت پر تنقید

جمہوری راگ الاپنا

جمہوری فیصلے !!!

زیرِ دباؤ جمہوریت

شمولیت کا مستقبل

جمہوریت اور سرحدیں

تجربے کے اسباق

Eamonn Butler's
AN INTRODUCTION TO
DEMOCRACY
جمہوریت
ایک تعارف

جمہوریت
کے نام

مصنف کے بارے میں

1. جمہوریت کی تفہیم

یہ کتاب کس بارے میں ہے ———— 12

12

'جمہوریت' کا مسئلہ ———— 13

جمہوریت کو محدود/پابند کرنا ———— 14

جمہوریت کی کشش ———— 16

تفہیم کے مزید مسائل ———— 18

صراحت کی ضرورت ———— 19

2. جمہوریت کی تاریخ

یونانی جمہوریت ———— 21

رومن جمہوریہ ———— 23

قرونِ وسطیٰ کا دور ———— 24

ابتدائی دورِ جدید ———— 25

آئینی جمہوریہ ———— 27

لبرل جمہوریت ———— 29

جمہوریت کی توسیع ———— 30

اپنی حدود سے آگے؟ ———— 31

جمہوریت کی موت؟ ———— 32

3. جمہوری ادارے

حکومت کا مقصد اور طاقت ———— 35

جمہوریت کا کلیدی کردار ———— 37

براہ راست جمہوریت ———— 38

نمائندہ جمہوریت ———— 39

لبرل جمہوریت ———— 40

4. جمہوریت کے اصول

لبرل جمہوریت کے لوازمات ———— 43

لبرل نمائندگی کے مطلوبہ عناصر ———— 47

لبرل جمہوریت کا کام/ عمل ———— 48

5. آج کی نمائندہ جمہوریتیں

پارلیمانی حکومت ———— 53

صدارتی نظام ———— 54

آئینی بادشاہتیں ———— 55

عوام کا کردار ———— 56

عمل/پراسیس کا تحفظ ———— 57

انتخابی نظام ———— 57

عوام کا احتساب ———— 60

جمہوریت اور حقوق کے درمیان تناؤ ———— 60

6. جمہوریت کے فوائد

طاقت کے ارتکاز کو روکنا ———— 62

تبدیلی کو جذب کرنے والا ———— 62

ہماری مشترکہ اقدار کی بات ———— 63

ایمانداری پر مبنی پالیسی کا فروغ ———— 64

تنقید اور ترقی ———— 65

انفرادی حقوق کا تحفظ ———— 66

امن اور خوشحالی ———— 67

خلاصہ ———— 68

7. جمہوریت پر تنقید

انتخاب کرنے والے/الیکٹرز کام کے نہیں ———— 69

یہ ناکارہ/ناکافی فیصلے کرتی ہے ———— 72
...اور برے فیصلے ———— 73
اس میں فوکس/توجہ قلیل المدتی ہے ———— 73
ریاستی طاقت پر انحصار کرتی ہے ———— 74
زیادہ بڑی حکومت کو فروغ دیتی ہے ———— 76
اس کے نادیدہ/خفیہ اخراجات ہیں ———— 78
8. جمہوریت کا حد سے زیادہ راگ الاپنا
جمہوریت بہترین نظام ہے ———— 80
یہ عوام کی حکمرانی ہے ———— 81
یہ رضامندی والی حکومت ہے ———— 81
ہر ایک کی سنی جاتی ہے ———— 82
جمہوریت مساوات کو فروغ دیتی ہے ———— 83
جمہوریت کمیونٹی/برادری کا احساس فراہم کرتی ہے ———— 84
جمہوریت ہمیں برے حکمرانوں سے بچاتی ہے ———— 85
9. جمہوری فیصلے کیسے کیے جاتے ہیں
انتخابات ———— 87
انتخاب کرنے والے/الیکٹرز ———— 88
امیدوار ———— 89
قانون ساز ———— 89
حکام ———— 91

سیاسی انحصار کرنے والے —— 91
خلاصہ —— 93
10. زیر دباؤ جمہوریت
سیاست کے قائم شدہ معمولات —— 95
بدلتے عالمی حالات —— 96
سیاسی نظام میں تبدیلیاں —— 97
ووٹرز میں تبدیلیاں —— 98
خلاصہ —— 100
11. شرکت/شمولیت کا مستقبل
شرکت کی شکلیں —— 101
شرکت کے حق میں دلائل —— 103
شرکت کے خلاف عملی دلائل —— 104
اصولی طور پر شرکت کے خلاف —— 106
کیا ہم واقعی 'مزید جمہوریت' چاہتے ہیں؟ —— 107
محدود جمہوریت کا نظریہ —— 109
12. جمہوریت اور سرحدیں
مغرب کی غلطیاں —— 111
ابھرتی ہوئی جمہوریتوں کے مسائل —— 113
جمہوری اقدار کو مسلط کرنے کی ناکام کوشش —— 114
بین الاقوامی ادارے —— 115

عالمی جمہوریت؟ 116
چھوٹے گروہوں کے لیے ایک نظام؟ 117
13. تجربے کے اسباق
کیا ہم واقعی جمہوریت چاہتے ہیں؟ 119
جمہوریت کا جواز کیا ہے؟ 120
ایک پائیدار جمہوریت کیسی ہو گی؟ 121
متبادل جمہوری نظام 123
جمہوریت سب کچھ نہیں ہے 125
14. جمہوریت کے بارے میں اقوال
اکثریت کا ظلم 128
طاقت خراب/بدعنوان کرتی ہے 128
جمہوریت کا کلچر 129

وضاحتیں اور جائزہ 129
چیلنجز اور تنقید 131
دیگر حوالہ جات 133
بنیادی/کلیدی اصطلاحات 137
آئی ای اے کے بارے میں 140

جمہوریت: اک تعارف

ایمن بٹلر

لندن پبلشنگ پارٹنرشپ لمیٹڈ (www.londonpublishingpartnership.co.uk) کے تعاون سے دی انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک افیئرز (پتہ: 2 لارڈ نارتھ اسٹریٹ ویسٹ منسٹر لندن SW1P 3LB) نے 2021 میں پہلی بار برطانیہ میں شائع کیا۔

انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک افیئرز کا مشن معاشی اور سماجی مسائل کے حل میں مارکیٹوں کے کردار کا تجزیہ اور وضاحت کر کے آزاد معاشرے کے بنیادی اداروں کے بارے میں تفہیم کو بہتر بنانا ہے۔

اس کتاب کا CIP کیٹلاگ ریکارڈ برٹش لائبریری میں دستیاب ہے۔

ISBN 978-0-255-36798-1 (انٹرایکٹو پی ڈی ایف)

انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک افیئرز (آئی ای اے) کی بہت سی اشاعتوں کا انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے یا انہیں دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ ترجمہ کرنے یا دوبارہ پرنٹ کرنے کی اجازت اوپر دیے گئے پتے پر ڈائریکٹر جنرل سے لی جانی چاہیے۔ کیپلر میں ٹائپ سیٹ از T&T

ٹی اینڈ ٹی پروڈکشنز لمیٹڈ نے (اس کتاب کا) فونٹ 'کیپلر' ترتیب دیا ہے۔

www.tandtproductions.com

مصنف کے بارے میں

ایمن بٹلر دنیا کے معروف پالیسی تھنک ٹینکس میں سے ایک۔۔ ایڈم سمتھ انسٹی ٹیوٹ۔۔ کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کے پاس معاشیات اور نفسیات میں ڈگریاں، فلسفہ میں پی ایچ ڈی، اور 'ڈاکٹر آف لیٹرز' کی اعزازی ڈگری بھی ہے۔ 1970 کی دہائی میں ایڈم اسمتھ انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں معاونت کے لیے برطانیہ واپس آنے سے قبل انہوں نے واشنگٹن میں امریکی ایوان نمائندگان کے لیے کام کیا، اور مشی گن کے ہلزڈیل کالج میں فلسفہ پڑھاتے رہے۔ ویلی فورج کی فریڈمز فاؤنڈیشن کا ایوارڈ 'فریڈم میڈل'؛ اور یوکے نیشنل فری انٹرپرائز ایوارڈ جیتنے والے ایمن اس وقت مونٹ پیلرین سوسائٹی کے سیکرٹری ہیں۔

ایمن بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سرخیل ماہر اقتصادیات اور مفکرین ایڈم اسمتھ، ملٹن فرائیڈمین، ایف اے ہائیک، لڈوِگ وون مائسز اور این رینڈ کے تعارف شامل ہیں۔ انہوں نے کلاسیکل لبرل ازم پر چھوٹی مگر معلوماتی کتب، 'پبلک چوائس'، 'میگنا کارٹا' اور 'آسٹرین سکول آف اکنامکس' کے ساتھ ساتھ 'دی کنڈنسڈ ویلتھ آف نیشنز'، 'دی بیسٹ بک آن دی مارکیٹ'، 'سکول آف تھاٹ: 101 گریٹ لبرل تھنکرز' اور 'این انٹروڈکشن انٹرپرینیورشپ' جیسی کتب بھی شائع کیں۔ ان کی کتاب 'فاؤنڈیشنز آف اے فری سوسائٹی' نے 2014 کا فشر پرائز جیتا۔ وہ 'فورٹی سنچریز آف ویج اینڈ پرائس کنٹرولز' کے شریک مصنف اور آئی کیو پر کئی کتابوں کے خالق ہیں۔ وہ پرنٹ، براڈکاسٹ اور آن لائن میڈیا میں اکثر اپنا حصہ ڈالتے اور کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

جمہوریت کی تفہیم

یہ کتاب کس بارے میں ہے

یہ کتاب جمہوریت کا سیدھا سادہ تعارف ہے: یعنی کہ یہ کیا ہے اور کیسے کام کرتی ہے، اس کی خوبیاں اور کمزوریاں، اس کے فوائد اور اس کی حدود کیا ہیں۔ کتاب کا بنیادی مقصد کسی کو بھی جمہوریت کو سمجھنے کے قابل بنانا ہے چاہے اس کو کبھی اس کا تجربہ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن بہت سے لوگ جن کا خیال ہے کہ وہ جمہوریت کو سمجھتے ہیں، انہیں بھی (اس کتاب سے) فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ وہ اکثر اس کی اہم ترین خصوصیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

جمہوریت کو سمجھنا ضروری ہے: آخر کار دنیا کی دو تہائی آبادی، سو سے زائد ممالک میں، ایسی حکومتوں کے تحت رہتی ہے جو جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے بہت کم حکومتیں دراصل جمہوریت کے نظریات کے مطابق رہتی ہیں، یا اس کے کلیدی اصولوں اور اداروں کا احترام کرتی ہیں، اس لیے جمہوریت کی واضح تفہیم اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر ہمیں اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ جب لوگ اسے صحیح طریقے سے نہیں سمجھتے تو جمہوریت کتنی آسانی سے ضائع ہو سکتی ہے یا اس کے ساتھ زیادتی ہو سکتی ہے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے، یہ کتاب جمہوریت کی تعریف کرتی ہے؛ اس کے مقاصد کو واضح کرتی ہے، اور حقیقی جمہوریت اور موجودہ بہت سی جعلی جمہوریت کے درمیان فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ کتاب جمہوریت کی تاریخ، اس خیال کی بدلتی ہوئی نوعیت اور اس کے حصول کے مختلف طریقوں کا خاکہ پیش کرتی ہے۔ یہ نہ صرف جمہوریت کے فوائد کا بلکہ اس کے بارے میں بہت سی ایسی روایتی قصوں کا بھی خلاصہ پیش کرتی ہے جو ہمیں اس کی حدود و قیود کے حوالے سے اندھا کر دیتی ہیں۔ آخر میں یہ کتاب یہ سوال اٹھاتی ہے کہ لوگ آج جمہوری سیاست سے اتنے مایوس کیوں ہو گئے ہیں، اور یہ کہ اس مایوسی کے خاتمے کیلئے کیا کوئی حل بھی نکالا جا سکتا ہے۔

"جمہوریت" کا مسئلہ

جمہوریت کو سمجھنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس لفظ نے اپنے معنی بدل لیے ہیں۔ جسے آج ہم "جمہوریت" کہتے ہیں یہ وہ جمہوریت نہیں ہے جو قدیم یونانیوں (جن کو اس خیال، اس طرزِ حکومت کی ابتدا کا کریڈٹ دیا جاتا ہے) کے ذہن میں تھا۔ ان کے نزدیک "جمہوریت" کا مطلب ایک ایسا نظام حکومت تھا جس میں شہری کھلی اسمبلیوں میں قانون بناتے، کلیدی پالیسیوں (مثال کے طور پر جنگ لڑنا) کا فیصلہ اور عہدیداروں کی تقرری کرتے تھے۔ تاہم ہمارے نزدیک 'جمہوریت' کا مطلب حکومت کا ایسا نظام ہے جس میں عوام ہر چند سال بعد نمائندوں (جیسے صدر، اراکین پارلیمنٹ یا سینیٹرز وغیرہ) کو منتخب کرنے کے لیے ووٹ دیتے ہیں جو پھر قوانین، پالیسیوں اور سرکاری تقرریوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔

لیکن اس (لفظ) کا یہ جدید استعمال بھی بہت سے مختلف معنی کا احاطہ کر سکتا ہے۔ لفظ 'جمہوریت' شاید ایسے نظام بیان کرے جن میں انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوں، جہاں خفیہ رائے شماری ہو اور انتخاب کے لیے امیدواروں کی ایک فہرست ہو، اور جہاں نمائندوں اور عہدیداروں کے اختیارات کی ایک حد

ہو۔ اور ان تمام امور کو یقینی بنانے کے لئے ایک آزاد و خود مختار عدلیہ ہو جو اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ تمام نمائندے اور حکام آئینی و قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے کام کر رہے ہیں۔ دوسری طرف 'جمہوریت' کا استعمال اکثر ایسے نظام بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جن میں ان میں سے کچھ خصوصیات مثالی سے کم یا سرے سے غائب ہی ہوتی ہیں۔ بہت سے ممالک میں، جو خود کو 'جمہوری' کہتے ہیں، بیلٹ صحیح معنوں میں خفیہ نہیں ہوتے، انتخابی عملہ بے ایمانی سے کام لیتا ہے، ووٹرز اور امیدواروں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے، عوامی مباحثے پر میڈیا کا کنٹرول ہوتا ہے، اور نمائندے بدعنوان و کرپٹ ہوتے ہیں۔

کچھ صورتس میں، بعض ممالک جمہوریت کے پھندے دکھاتے ہیں (جیسے انتخابات، پارلیمنٹ اور عدالتیں) لیکن وہاں امیدوار کھڑا کرنے کی اجازت صرف ایک ہی پارٹی کو ہوتی ہے۔ پالیسی ساز اور جج کبھی بھی حکمران کے اختیارات پر سوال نہیں اٹھاتے، اور حکام کو شہریوں کی زندگیوں اور ان کے طرز عمل پر تقریباً لامحدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال شمالی کوریا ہے جہاں انتخابات میں ٹرن آؤٹ تقریباً 100 فیصد ہوتا ہے لیکن ووٹ تقریباً سارے ہی ایک ہی جماعت (ڈیموکریٹک فرنٹ فار دی یونیفیکیشن آف دی فادر لینڈ) کے امیدواروں کو پڑتے ہیں۔ (یہ امر اس اصل صورتحال کا غماز ہے جس کے بارے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے)۔

جمہوریت کو محدود/پابند کرنا

جمہوریت کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ یہ اکثریت کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خیال صریحاً غلط ہے۔ مثال کے طور پر محض انتخابی کامیابی اکثریتی جماعت کو اقلیتوں کے گھر، کاروبار اور دولت کو ضبط کرنے یا انہیں قید یا جلاوطن کرنے، ان پر تشدد کرنا یا انہیں ذبح کرنے کا حق کیسے دے سکتی ہے؟ انسانوں کی بعض ایسی اقدار یا حقوق ہیں، جیسے

لوگوں کی جان، آزادی اور جائیداد کا تقدس، جو اکثریت کی حکمرانی سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ حقیقت کہ ایک اکثریت ہی ان اقدار کی خلاف ورزی کا فیصلہ کرتی ہے ان کے اس عمل کو ہرگز اخلاقی یا سیاسی جواز فراہم نہیں کرتی ہے۔

تقریباً 2,400 سال پہلے، قدیم یونانی مفکرین جیسے افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ بلاشبہ وہ جمہوریت کو حکومت کی ایک انتہائی خطرناک شکل سمجھتے تھے، لیکن صرف اس لیے نہیں کہ وہ امیر اشرافیہ تھے۔ جمہوریت بھی آسانی سے ہجوم کی حکمرانی بن سکتی ہے جس کے تحت کسی کی بھی جان یا مال محفوظ نہیں ہو گا۔ ارسطو (350 قبل مسیح) اپنی کتاب 'پالیٹکس' میں لکھتے ہیں: 'جہاں انصاف خود مختار نہ ہو (وہاں) عوام 'بادشاہ' بن جاتے ہیں، اور ان کا مطمحِ نظر مکمل اقتدار/طاقت کا حصول ہوتا ہے اور وہ ایک آقا کی طرح بن جاتے ہیں۔'

دو ہزار سال بعد، 55 زمینداروں، غلاموں کے آقا اور دیگر ممتاز افراد کو جنہوں نے نئی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا آئین تیار کیا تھا، ان کو بھی ایسے ہی خدشات لاحق تھے۔ انہوں نے یونانی طرز کی جمہوریت نہیں قائم کی جس میں ہر چیز کا فیصلہ عوام کریں گے بلکہ ایک عوامی جمہوریہ تشکیل دیا جہاں عوام فیصلہ سازی کے لیے نمائندوں کا انتخاب کریں گے۔ انہوں نے سرکاری حکام کے اختیارات کو محدود، خاص طور پر فرد اور اقلیتوں کے تحفظ کیلئے، فیصلہ سازی کے عمل کو نہایت ہی احتیاط سے ڈیزائن کیا، اگرچہ شرمناک طور پر انھوں نے یہ تحفظ آبادی کے اس چوتھائی حصے کو نہیں دیا جو غلام یا آبائی امریکی تھے۔

ایسے جمہوری ادارے جو ہماری زندگیوں پر کنٹرول کے بجائے ہماری اقدار کی خدمت، اور ان کا تحفظ یقینی بنائیں اسی لیے جمہوریت کی سب سے حقیقی شکل (جدید معنوں میں) ہے اور جو جمہوری تصور کی اصل روح کا احاطہ کرتی ہے اسے لبرل جمہوریت کہا جاتا ہے۔ اس کی وکالت کرنے والوں کا ماننا ہے کہ جمہوریت کا بنیادی مقصد لوگوں کو پابند کرنا یا ان پر قابو پانا نہیں ہے بلکہ انہیں آزاد کرنا ہے۔ ان لبرلز (یورپی معنوں میں) کے نزدیک حکومت افراد کو وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے نہیں

بنائی جاتی جسے اکثریت 'صحیح/درست' قرار دے، بلکہ حکومت ہر ایک کو جتنا ممکن ہو آزاد رکھنے اور لوگوں یا پھر ریاست کی جانب سے طاقت اور جبر کے استعمال کو کم سے کم کرنے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ (بٹلر2015اے)۔

لیکن اِس امن اور آزادی کے لئے ضروری ہے کہ اکثریت کی حکمرانی محدود ہو۔ لبرلز کے مطابق ایک حقیقی لبرل جمہوریت میں ایک کے مقابلے میں ایک ہزار جیسی بھاری اکثریت کو بھی یہ حق نہیں حاصل کہ وہ جو چاہے کرتی پھرے: (بلکہ) اکثریت کو ہمیشہ تمام افراد کے بنیادی حقوق اور آزادیوں کا احترام کرنا ہو گا اور انہیں برقرار رکھنا ہو گا۔ ان حقوق اور آزادیوں کو اکثریت کے نظریہ پر ترجیح بھی اس لئے ہی دی جاتی ہے کہ ایک حکومت کے وجود کا بنیادی جواز ہی ان (حقوق اور آزادیوں) کا تحفظ ہے۔

لبرلز اس امر پر متفق نہیں کہ افراد کے حقوق دراصل ہیں کیا، اور وہ کہاں سے آتے ہیں۔ اس کے باوجود لبرل جمہوریتوں میں انفرادی حقوق نسبتاً کہیں زیادہ وسیع اور بہتر طور پر محفوظ نظر آتے ہیں۔ امریکی پولیٹیکل اکانومسٹ (سیاسی معشیت دان) جیم لیمکی (2016) کے مطابق ایسا مختلف سیاسی نظاموں کے درمیان مسابقت کی وجہ سے ہو سکتا ہے، جو لوگوں کو آزاد معاشروں کی طرف ہجرت کرنے پر آمادہ کرتے ہیں جہاں شہریوں کی انفرادیت کا احترام کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی کشش

جمہوریت کی حمایت کرنے والوں کا ماننا ہے کہ قانون اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد (جیسے بادشاہ یا آمر) یا کسی گروہ (جیسے حکمران خاندان یا اشرافیہ) کی خواہش پر وضع نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بجائے عام لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ کن قوانین کے تحت رہنا چاہتے ہیں یا کم از کم انہیں یہ حق دینا چاہیے کہ وہ فیصلہ کریں کہ ان کے لئے کون قوانین بنائے گا۔ ان کا اصرار ہے کہ یہ انتخاب/چوائسز

سیاسی مساوات کی بنیاد پر کیے جانے چاہئیں جہاں ہر ایک کا ووٹ یکساں شمار ہوتا ہے۔ مثالی طور پر تو زیادہ سے زیادہ شہریوں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ لوگوں کو اہم مسائل پر سوچنے اور بولنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ مثالی طور پر تو رائے دہندگان کو ان کی اپنی حکمرانی کے بارے میں اچھی طرح سے باخبر، قابل اور معقول ہونا چاہیے۔ اور ایسے مستحکم، قابل بھروسہ اور دیانتدار ادارے ہونے چاہئیں جو عوام کے فیصلوں کو منصفانہ طریقے سے پالیسی کی شکل دے سکیں۔

یہ جمہوری نظریات نہایت ہی پرکشش نظر آتے ہیں۔ آخر کار کون یہ نہیں چاہے گا کہ اس حوالے سے اس کی رائے لی جائے کہ ان پر کس طرح سے حکومت کی جائے، بجائے اس کے کہ کوئی اور ان کی قسمت کے فیصلے کرتا پھرے۔ کون نہیں چاہے گا کہ آمروں کی وحشیانہ طاقت سے بچا جائے؟ کون ایسا سوچنا پسند نہیں کرے گا کہ اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے، اور منصفانہ طور پر دی جاتی ہے؟

بلاشبہ یہ جمہوری نظریات اتنے پرکشش ہیں کہ بدقسمتی سے تقریباً تمام حکومتیں ان کے احترام کا دعویٰ کرتی ہیں، چاہے وہ ان پر عمل کریں یا نہ کریں۔ 'جمہوری' کہلانا احترام اور قبولیت کی علامت ہے۔ جیسا کہ بیسویں صدی کے انگریزی ناول نگار اور نقاد جارج آرویل (1946) نے نشاندہی کی: 'یہ تقریباً عالمی سطح پر محسوس کیا جاتا ہے کہ جب ہم کسی ملک کو جمہوری کہتے ہیں تو ہم اس کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ہر قسم کی حکومت کے علمبردار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی حکومت یا نظام جمہوری ہے۔

نتیجہ پھر یہ نکلتا ہے کہ لفظ "جمہوریت" اپنے معنی کھو بیٹھتا ہے۔ اکثریتی جماعتیں 'جمہوری' انتخابات میں اپنی فتح کو ایسے لیتی ہیں جیسے انہیں دوسروں پر ظلم کرنے، اپنے فائدے کے لیے عوامی فنڈز خورد برد کرنے اور اپنے ساتھیوں کو سرکاری نوکریاں اور ٹھیکے دینے کا مکمل اختیار مل گیا ہے۔ ڈکٹیٹر/آمر اپنے سیاسی مخالفین کو جیلوں میں ڈال دیتے ہیں اور جعلی انتخابات کراتے ہیں جن میں انہیں 100 فیصد ووٹ پڑتے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ 'جمہوری طور پر منتخب شدہ' ہیں۔ کئی جگہوں پر محض حکومتی رہنماؤں اور ان کی پالیسیوں پر تنقید کرنے سے آپ کو غداری کے الزام میں

گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی زیادتیاں جمہوریت کے تصور کے لیے ناگوار ہیں۔

تفہیم کے مزید مسائل

لفظ کے معنی کی ایسی دانستہ اور مذموم تحریفات کے ساتھ ساتھ اس بارے میں حقیقی اور وسیع غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں کہ جمہوریت دراصل ہے کیا اور یہ کیسے کام کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ایشیاء میں بہت سے لوگ جمہوریت کو اس لئے مسترد کرتے ہیں کہ تنازعات، تذبذب اور 'شارٹ ٹرم ازم' (طویل المدت مفاد، نتائج و فوائد کی بجائے قلیل المدت مفاد کو ترجیح دینے والا نظام) پیدا کرتی ہے۔ وہ اس کی طاقت، مقبولیت اور لچک کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے مغربی لوگ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت خوشحالی، آزادی، مساوات اور امن کی واحد کنجی ہے۔ جمہوریت کے بارے میں ان کا نظریہ اتنا رنگین و خوش فہم ہے کہ وہ اس کے مسائل اور حدود کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔

درحقیقت جمہوریت کی تعریف و ستائش ہی اس کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس کے پر جوش حامی اکثر جمہوریت کو بہترین نظام حکومت قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ اکثریت کی منظوری پر منحصر ہے۔ لیکن اگر اکثریتی ووٹنگ واقعی فیصلے کرنے کا بہترین طریقہ ہے تو ہم اسے ہر فیصلے کے لیے کیوں نہ استعمال کریں؟ یہ دلیل بہت سے لوگوں کو قائل کرتی ہے کہ ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے؛ لیکن افسوسناک نتیجہ/حال یہ ہے کہ روزمرہ کے فیصلے بھی جو کبھی افراد پر چھوڑے جاتے تھے کہ وہ کیسے رہتے ہیں، کیا کھاتے ہیں یا پیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ عوام میں کیا بولیں گے، یہ سب آئے روز اس امر کے تابع ہوتے جا رہے ہیں کہ اکثریت کی رائے کس امر کی اجازت دے گی۔

لبرلز کے نزدیک اس سے جمہوریت کے کاندھوں پر ایک ایسے کام کا بوجھ پڑتا ہے جس کے لیے یہ ڈیزائن ہی نہیں کی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جمہوریت کا مقصد باہمی دفاع جیسے ان چند اجتماعی فیصلوں کے علاوہ کچھ کرنا نہیں تھا جو لوگ انفرادی طور پر نہیں کرسکتے تھے۔ یہ افراد کے حقوق کے تحفظ کے لیے تیار کی گئی تھی نہ کہ اکثریت کی خواہش پر انھیں کم کرنے کے لیے۔ اس کا مقصد لوگوں کی

آزادیوں کو بڑھانا تھا انہیں سکیڑنا یا محدود کرنا نہیں۔ یہ لوگوں پر جبر کو کم سے کم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، اسے جائز قرار دینے کے لیے نہیں۔

صراحت کی ضرورت

جمہوریت کے ثمرات کی پرستش میں اس کی حدود کو نظرانداز کرنا آسان ہے۔ اکثریتی فیصلہ سازی ہر مسئلے کا حل نہیں ہے۔ یہ (نسبتاً چند) فیصلے لینے کا محض ایک قابل فہم طریقہ ہے جو صرف اجتماعی طور پر کیے جاسکتے ہیں۔ لبرلز کا استدلال ہے کہ جمہوریت (بہت سے) فیصلوں کو منقطع کرنے یا ان کی جگہ لینے کا ذریعہ نہیں ہے جو افراد خود مکمل طور پر ٹھیک کرسکتے ہیں، اور یہ صرف وہاں کام کرتی ہے جہاں اِس آزادی/حق کا احترام کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کے نظریات اور سیاسی عمل، جس کے زریعے یہ کام کرتی ہے، کی ناقص حقیقت کے درمیان بھی بہت بڑا فرق ہے۔ جب اکثریتی فیصلہ سازی کو وسعت دی جاتی ہے تو سیاست، جو اجتماعی فیصلہ سازی کا ایک ناگزیر حصہ ہے، زندگی کے ہر پہلو، بڑے اور چھوٹے، میں گھس جاتی ہے، اور یوں جمہوریت کے تصور کو ہی آلودہ کردیتی ہے۔ اس کے بعد خطرہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ 'جمہوریت' کے ہی مخالف ہوجائیں، یہ سوچ کر کہ یہ صرف سیاسی مفادات کی طاقت کا ہی کھیل ہے۔ اور یہ کہ وہ اس نظام کو ترک کردیں جو انہیں اس سے بچا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کیا ہے ور کیا نہیں ہے اس بارے میں واضح ہونا بہت ضروری ہے۔ ہمیں اس درجہ قابل ہونے کی ضرورت ہے کہ یہ سمجھ سکیں کہ بہت سارے سیاسی نظاموں میں سے کون سا نظام ہے جو 'جمہوری' ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور وہ درحقیقت جمہوریت کے نظریات اور اصولوں کے عین مطابق ہے۔ کہ ہم جمہوریت کے بنیادی مقصد کو سمجھ اور اس کی حدود کو پہچان سکیں۔ یہ جاننے کے قابل کہ جمہوریت کون سے سوالات کا فیصلہ کرنے کے لیے موزوں ہے اور کن سوالوں کا فیصلہ کرنے کے لئے

نہیں۔ یہ جاننے کے قابل کہ اچھی جمہوری حکومت کو کیا چیز فروغ دیتی ہے اور کون سی چیز اسے خراب کرتی ہے۔ یہ تسلیم کرنے کے قابل کہ ایسی اعلیٰ اقدار ہیں جن کا ہمیں بھاری اکثریت کی رائے یا مرضی کے باوجود دفاع کرنا چاہیے۔ اس بات کا ادراک کرنے کے قابل کہ جمہوریت کو اپنی حدود میں رکھنا ہو گا۔ اس امر کی تحسین یا سراہنے کے قابل کہ جمہوریت اخلاقی، ثقافتی اور ادارہ جاتی بنیادوں پر ٹکی ہوئی ہے جنہیں برقرار رکھنے کی ضرورت ہے اور جنہیں دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہے۔ اور اس بات سے آگاہ رہنے کے قابل کہ جمہوریت کو سمجھنے، چلانے اور محفوظ رکھنے کے لیے کافی محنت درکار ہوتی ہے۔

جمہوریت کی تاریخ

لفظ 'جمہوریت' سولہویں صدی کے فرانس سے انگریزی میں آیا، لیکن اس کی ابتدا اس سے بھی بہت پرانی ہے۔ تقریباً چار پانچ ہزار سال قبل، میکانی دور (Mycenaean-era) کے یونانیوں نے آبادی کے گروہوں کو 'ڈاموس' کہا، حالانکہ یہ اصطلاح شاید 'ڈومو' سے آئی ہو جو اس سے بھی پرانی سومیری تہذیب، آج کے جنوبی عراق، میں اس جیسا ہی ایک تصور تھا۔ کلاسیکی یونانی میں یہ 'ڈیموس' بن گیا جس کا مطلب 'لوگ' یا غریب باشندوں کا ایک 'بڑا' گروہ ہو سکتا ہے۔ 'کراتوس' کے ساتھ مل کر، جس کا مطلب 'طاقت' یا 'کنٹرول' ہے، یہ جدید لفظ کی جڑ فراہم کرتا ہے۔

یونانی جمہوریت

تقریباً پانچ ہزار سال قبل میسوپوٹیمیا (دریائے دجلہ اور فرات کے درمیان 'زرخیز ہلال') میں آباد ہونے والے سومیری باشندوں کو دنیا کی پہلی معروف تہذیب کی بنیاد رکھنے کا سہرا جاتا ہے۔ کچھ اسکالرز کا کہنا ہے کہ شاید ان کے ہاں جمہوریت کی ابتدائی شکل بھی پائی جاتی ہو، اور یہ کہ ان کی شہری ریاستوں کے بادشاہ، جیسے یورک کے گِلگامش، مکمل اختیار نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ عمائدین کی کونسلوں کے زریعے امورِ حکومت چلاتے تھے۔ تاہم اس کے شواہد کافی کمزور ہیں۔

اس سے بھی آگے مشرق میں، تقریباً 2,600 سال پہلے برصغیر پاک و ہند کی آزاد 'جمہوریتوں' میں جمہوریت کا کوئی صورت (ورژن) ابھری ہوگی۔ یہاں پر بھی ان کے بادشاہ، راجے مہاراجے مشاورتی مجالس (اسمبلیوں) کے زریعے حکومت کرتے تھے جو تمام آزاد مردوں کے لیے کھلی ہوتی تھیں، جو

وسیع سیاسی اختیار رکھتی تھیں اور جن کی باقاعدگی سے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس حوالے سے بھی بہت کم تفصیل موجود ہے، اور محققین بھی اس حوالے سے مختلف رائے رکھتے ہیں کہ آیا اس طرح کے بندوبست یا انتظام واقعی میں عوامی طاقت کی مثال یا ان کے مظاہر تھے۔

تاہم اس بات کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ تقریباً 2500 سال قبل یونان (خاص طور پر ایتھنز) میں جمہوریت عروج پر تھی۔ درحقیقت کلاسیکی یونان میں تقریباً 1,000 چھوٹی جمہوریتیں تھیں: ہر ایک ایک آزاد شہری ریاست (پولس جس سے لفظ 'سیاست' آیا ہے) تھی۔ تاہم ایسی چھوٹی برادریوں میں اقتدار آسانی سے چند اشرافیہ کے ہاتھوں میں جمع ہو سکتا ہے۔ جمہوریت کے خیال کا مقصد ہی اس کو روکنا اور ایک وسیع گروپ کی طرف سے پالیسی کا فیصلہ کرنا تھا۔ لیکن یہ پھر بھی آبادی کی صرف ایک اقلیت ہی ہوتی تھی کیونکہ 'جمہوری' ایتھنز میں غلام، بچوں، خواتین اور غیر ملکیوں کو فیصلہ سازی کے اس عمل سے باہر رکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ایتھنز کے تقریباً چھ سے دس ہزار مرد کھلے اجلاسوں میں جمع ہوتے، اور قوانین، جنگوں اور اہلکاروں کی تقرری جیسے معاملات پر بحث اور فیصلہ کرتے تھے۔

جمہوری نظریہ کی مشہور تعریف ایتھنز کے سیاستدان اور جنرل پیریکلز (431 قبل مسیح) نے بیان کی: 'اجتماعی خود مختاری، سیاسی مساوات، آزادی اور رواداری، اور قانون کا احترام، دوسروں کے لیے اور اپنے فرائض کے لیے۔' لیکن مقبول اسمبلیوں کی طاقت اور چپقلش نے افلاطون اور ارسطو جیسے قدیم مفکرین کو بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ غریب شہریوں کی بڑی تعداد اپنے بہترین مفادات کے حوالے سے بہت زیادہ نادان اور کوتاہ اندیشی کا شکار ہے اور انہیں عوامی یا بازاری لیڈر بڑی آسانی سے متاثر کر سکتے ہیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ مقبول جمہوریت ظلم کی ایک نئی شکل، ہجوم کی حکومت، میں بدل سکتی ہے۔ اور انہیں خدشہ تھا کہ یہ ہجوم صرف (ان کے جیسے) فارغ البال و خوشحال لوگوں کو ہی لوٹے گا یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ اکثریت کے ووٹ نے اس طرح کی لوٹ مار کو جائز اور قانونی بنا دیا ہے۔

افلاطون کو اس حل یہ سوجھا کہ حکمرانی کو عقلمند 'فلسفی بادشاہوں' پر چھوڑ دیا جائے لیکن ارسطو نے

محسوس کیا کہ ایسے اپنی مثال آپ لوگ موجود ہی نہیں ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ جمہوریت (جو قدیم یونان میں مؤثر طریقے سے غریبوں کی حکمرانی تھی) شہریوں کو چند سری/اشرافیہ کی حکومت سے بچا سکتی ہے (جسے موثر طور پر امیروں کی حکمرانی کہا جاسکتا ہے) لیکن اس جمہوریت کو بدلے میں معمولی دولت رکھنے والے شہریوں کے ذریعے روکنا ضروری تھا جن کی تعداد بہت کم تھی۔

رومی جمہوریہ

قدیم روم کے مفکرین کو جمہوریت کے بارے میں ایسی ہی بد گمانیاں تھیں۔ لیکن کم از کم ان کی جمہوریت ایک ادارہ جاتی فریم ورک/ڈھانچے کے ماتحت تھی۔ روم ایک جمہوریہ (لاطینی res publica سے یا 'تِھنگ آف دی پیپل'۔۔ مطلب لوگوں کی شے یا چیز) تھا اگرچہ بعد میں اس کی جگہ قیصروں کی آمریت نے لے لی۔

جمہوریہ حکومت کا ایک ایسا نظام ہے جو وضع کردہ قواعد کے ایک مجموعے کے تحت چلتا ہے جو (قواعد) اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ (نظام) کس طرح کام کرے گا اور کس حد تک اہم فیصلے کر سکتا ہے۔ یہ قواعد جو بعض اوقات آئین میں واضح طور پر درج ہوتے ہیں، یہ اختیارات رکھنے والوں کی طاقت کو اقلیتوں اور افراد کے حوالے سے من پسند فیصلوں کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں یعنی ان کے اختیارات کی ایک حد مقرر کرتے ہیں۔ ایک جمہوریہ 'جمہوری' بھی ہو سکتی ہے (جس میں عام لوگ اپنی نمائندگی کے لیے قانون سازوں کا تقرر کرتے ہیں) یا یہ 'امر شاہی' (جسے خود کو خود ہی منتخب کرنے والی اشرافیہ چلاتی ہے) بھی ہو سکتی ہے؛ لیکن دونوں تسلیم شدہ قواعد کی حدود میں رہ کر امور حکومت چلاتی ہیں۔

رومن ریپبلک میں کچھ جمہوری اور کچھ امر شاہی خصوصیات تھیں۔ یہ کبھی 'لوگوں کی چیز' رہی ہی نہیں۔ اس کے دو کونسلوں کے پاس تقریباً بادشاہ جتنے اختیارات تھے جنہیں منتخب عوام نہیں بلکہ اشرافیہ کی ایک کمیٹی کرتی تھی۔ سینیٹ بھی اشرافیہ ہی کی ایک مجلس تھی۔ اسے بھی عوام منتخب نہیں کرتے تھے۔

تاہم اہل رائے دہندگان یعنی مردانہ آبادی (شہری) قانون سازی کو ویٹو یا مسترد کرنے کا اختیار رکھنے والے ٹریبونز، اور اسے نافذ کرنے والے مجسٹریٹس جیسے کچھ دیگر اہم عہدیداروں کا انتخاب کر سکتے تھے (اور ناگزیر حالات میں انہیں اپنے عہدوں سے ہٹا بھی سکتے تھے۔

ہنگامی حالات میں تو فیصلہ سازی میں عوامی شرکت اور بھی زیادہ محدود ہو جاتی تھی جب سینیٹ اور کونسلروں کو آمروں کی تقرری کا اختیار ہوتا تھا۔ ی آمر ایسے افراد ہوتے تھے جنہیں مکمل لیکن عارضی اقتدار سونپا جاتا تھا۔ لیکن ان آمروں کو شہنشاہ بننے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا جو پھر تاحیات اقتدار پر قابض رہتے تھے۔ اگرچہ شروع کے شہنشاہ پرانی جمہوریہ کے ادارہ جاتی جال کو برقرار رکھنے کے خواہاں ل ظر آئے، تاہم اس حوالے سے کسی کو کوئی شک نہیں تھا کہ طاقت کا اصل مرکز کہاں ہے۔

قرونِ وسطیٰ کا دور

آئس لینڈ کی 'اَلتھِنگ'، جو 930 کے لگ بھگ قائم ہوئی اور آج بھی موجود ہے، دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ تمام آزاد مردوں کے لیے کھلی رہتی تھی، جو تھنگ ویلر (Thingvellir) میں 'Law Rock' (لاراک یا لاگ برگ جنوب مغربی تھنگ ویلر میں وہ چٹانی یا پتھریلی جگہ تھی جہاں اس پارلیمان کا اجلاس منعقد ہوتا تھا) کے سامے سالانہ ملاقات کرتے تھے۔ ایک شخص، لاء سپیکر، موجودہ قوانین کو بہ آواز بلند پڑھتا (خوش قسمتی سے قوانین اتنے زیادہ نہیں ہوتے تھے) اور پھر ان پر عام بحث ہوتی تھی۔ تاہم پھر بھی صرف پچاس ممتاز شہری ہی ہوتے تھے جن کے پاس ان قوانین کے حوالے سے فیصلہ سازی کا اختیار تھا۔

1215 میں، انگلستان کے ظالم بادشاہ جان کو اپنے رئیسوں نے للکار اور مطالبہ کیا کہ بادشاہ میگنا کارٹا کو قبول کریں۔ میگنا کارٹا وہ 'عظیم چارٹر' جس نے بادشاہ کے اختیارات کو محدود اور خاص طور پر نئے قوانین اور ٹیکسوں کے لیے امراء یا رئیسوں کی رضامندی لازمی قرار دی تھی۔ یہی چارٹر آگے وہ بنیاد بنا

جس پر انگلینڈ کی پارلیمنٹ/قائم کھڑی کی گئی (بٹلر b2015)۔

عین اسی دور میں آس پاس یورپ کے دیگر علاوقوں یا ممالک میں تجارتی شہر ابھرنا شروع ہو گئے تھے جن میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے اصول بنائے تھے۔ یہ بادشاہوں کے مبینہ 'خدا کے عطا کردہ اختیار' کے لیے ایک چیلنج تھا، لیکن یہ سوچ و خیال معاشرے میں سرایت اختیار کرتا گیا کہ فیصلے ایک طاقتور مرکزی حکمران کے بجائے مقامی عوامی اتفاق رائے سے ہونے چاہئیں۔

پندرہویں صدی (1400) کے آخر تک، اطالوی شہری ریاستوں کو معقول طور پر جمہوریہ کہا جاسکتا ہے۔ انہیں آئینی امر شاہی یا اشرافیہ کی حکومت کہاجائے تو زیادہ درست رہے گا: جہاں اگرچہ حکمرانی پوری عوام کے بجائے چھوٹے گروہوں تک محدود تھی، تاہم اس کے باوجود فیصلہ سازی تسلیم شدہ قواعد کے تابع تھی۔ اور سیاسی عمل بارے رائے عامہ کی اہمیت کو اچھی طرح سے تسلیم کیا گیا: امور جہانبانی (سٹیٹ کرافٹ) پر اپنے موثر کام میں، سفارت کار اور فلسفی نکولو میکاولی (1513) نے حکمرانوں/برسر اقتدار اشرافیہ کو مشورہ دیا کہ اگر وہ عوام کو اپنے ساتھ لے کر چلیں تو ان کی ریاستیں زیادہ مضبوط ہوں گی۔

ابتدائی دور جدید

شمالی یورپ میں، خاص طور پر لبرل تجارتی معیشتوں جیسے نیدرلینڈز میں، سیاسی طاقت یا اختیار بھی کم مرکزیت اختیار کر گیا۔ جمہوری نظریات کے عروج کو سولہویں اور سترہویں صدی کے مذہبی سدھار یا اصلاح سے مزید تقیت ملی جب خدا کے سامنے مساوات پر زور اور تعلیم اور خواندگی کو فروغ دیا گیا: ایک اچھے پروٹسٹنٹ کے لیے خدا کا کلام پادری کی بجائے خود پڑھنے کے قابل ہونے کی ضرورت زور دیا گیا۔

برطانوی جزائر میں مطلق العنان بادشاہوں (آمروں) اور جمہوری نظریات کے درمیان جدوجہد 1640

کی دہائی میں مکمل خانہ جنگی میں بدل گئی جب بادشاہ چارلس اول نے پارلیمنٹ کی رضامندی کے بغیر ٹیکس بڑھانے کی کوشش کی۔ 1647 میں، مساوات کے حامیوں نے، جو اشرافیہ کے ہر طرح کے استحقاق کی مخالفت کرتے تھے، اس بات پر بحث کی کہ اسے کس چیز سے بدلنا چاہیے یا یہ کہ اس کا متبادل کیا ہونا چاہیے۔ انہوں نے اداروں کے ایک حیرت انگیز جدید سیٹ/مجموعے کا مطالبہ کیا: ایک جمہوری حکومت جس میں آفاقی (صرف مردوں کی ہی سہی) حق رائے دہی، متواتر انتخابات اور منصفانہ انتخابی حدود، قانون کی نظر میں برابری، مذہبی رواداری، اور جبری بھرتی نہ ہو۔ لیکن چارلس کو معزول کرنے کے بعد اقتدار تک پہنچنے پر پارلیمانی لیڈر اولیور کرام ویل بھی اس بادشاہ سے کم مطلق العنان ثابت نہیں ہوا جس کی جگہ اس نے لی تھی: اس نے مساوات کے حامیوں کو گرفتار کروایا اور بارہ سال تک فوجی حکمرانی نافذ رکھی۔

اس ہنگامے نے حکومتی اختیار کے ماخذ اور مقصد کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر اکسایا۔ سترہویں صدی کے انگریز فلسفی تھامس ہوبا (1651) نے تجویز پیش کی کہ حکومت ایک 'سوشل کنٹریکٹ' کا نتیجہ ہے جو افراد نے اپنے آپ کو باہمی جارحیت اور لالچ سے بچانے کے لیے تشکیل دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ایک حاکم کو اس نئے نظام میں بطور سربراہ اسی طرح کا کنٹرول حاصل ہونا چاہیے جس طرح سر کو ایک جسم پر حاصل ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک بغاوت کرنے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں تھا کیونکہ حکومت یا حکمران کو للکارنے یا چیلنج کرنے سے معاشرہ واپس حالتِ جنگ میں جاسکتا تھا۔ تاہم، بعد میں آنے والے ایک اور انگریز فلسفی، جان لاک (1689) نے اسی خیال۔۔ 'سوشل کنٹریکٹ'۔۔ کو بالکل مختلف نقطہ نظر کے ساتھ پیش کیا۔ اس نے خاص طور پر اپنے انفرادی حقوق کے تحفظ اور اپنی آزادیوں کو مزید وسعت دینے کے لیے افراد کی جانب سے ایک ریاستی ڈھانچہ قائم کرنے کا تصور پیش کیا۔ لہٰذا ریاست کو ان پر صرف وہی اختیار تھا جو انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے اسے رضاکارانہ طور پر منتقل کیا تھا۔ بادشاہ عوام کا خادم تھا: ایسے نہیں کہ وہ جو کچھ بھی مناسب سمجھے، کرتا پھرے۔ اور

لوگوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ایسے بادشاہ کو معزول کریں جس نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچایا اور ظالمانہ حکومت کی۔

تب تک ایک اور بادشاہ، جیمز دوئم، معزول کیا جاچکا تھا۔ بادشاہت اسی وقت بحال ہوئی جب مستقبل کا بادشاہ ولیم سوئم پارلیمنٹ اور عوام کے اختیارات کا اسی طرح احترام کرنے پر راضی ہوا جیسا کہ "بل آف رائٹس' (1689) میں درج ہے۔ اس آئینی انتظام کے ذریعے بادشاہ کی طاقت محدود کر کے ملک ایک آئینی بادشاہت بن گیا۔ اسے آج بھی ایک آئینی بادشاہت سمجھا جاتا ہے حالانکہ بادشاہ کے اختیارات اب اور بھی زیادہ محدود ہو چکے ہیں اور اصل اختیار جمہور (عام لوگوں) کے ذریعے منتخب ہونے والی پارلیمنٹ کے پاس ہے۔ اس لیے جدید برطانیہ کو آئینی جمہوریت کہنا زیادہ درست رہے گا۔

آئینی جمہوریہ

جان اوک کے خیالات سے اس ملک کے بانی بہت زیادہ متاثر تھے جسے کہ بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی صورت میں معرض وجود میں آنا تھا۔ جان لاک ہی کی طرح انہوں نے بھی اعلان آزادی (1776) میں شاہ جارج سوئم کی 'بدسلوکیوں اور غاصبیت' کی فہرست پیش کرتے ہوئے بادشاہوں کی صوابدیدی اختیارات کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے اگرچہ سیاسی مساوات پر زور دیا لیکن یہ اندیشہ بھی انہیں لاحق رہا کہ جمہوریت خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے کہ یہ آسانی سے ہجوم کی حکمرانی میں بدل سکتی ہے۔ انہوں نے اس معاملے پر بحث مباحثہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ عوامی معاملات میں عوام کی شمولیت یا شرکت اچھی حکومت کا صرف ایک جزو ہی ہے۔ انہیں جس چیز کی ضرورت تھی وہ جمہوریہ تھی۔۔۔ نہایت احتیاط اور تدبر سے قواعد و ضوابط کے مطابق قائم کی گئی ایک ایسی حکومت جہاں فیصلے عوام کے منتخب کردہ نمائندے کریں لیکن جس میں وہی نمائندے بھی محدود اختیارات اور تحریری آئین میں صراحت کے ساتھ عام لوگوں ہی کیلئے وضع کردہ قوانین کے تابع ہوں گے۔

جمہوریت کا مطلب آزادی نہیں ہے۔ جمہوریت 'دوپہر کے کھانے میں کیا کھایا جائے' کے حوالے سے دو بھیڑیوں اور ایک میمنے کے درمیان ووٹنگ ہے۔ آزادی بعض ایسے حقوق کو تسلیم کرنے سے ہی ملتی ہے جو شاید 99 فیصد ووٹ لے کر بھی حاصل نہ کیے جا سکیں۔ مارون سمکن (1992)، 'انڈیویژوول رائٹس (فرد کے حقوق)'، لاس اینجلس ٹائمز

فرانسیسی فلسفی مونتسکیو (1748) کا استدلال یہ تھا کہ جمہوریت کبھی بھی اچھی طرح سے کام نہیں کر سکتی کیونکہ لوگ اپنے مفادات کو عام مفادات پر ترجیح دیتے ہیں۔ خاص طور پر، جنہیں اختیارات دیئے گئے وہ اس کا غلط استعمال کریں گے۔ اور یہ لاک، امریکیوں اور ان کی پیروی کرنے والے بہت سے لوگوں کے لیے خاص طور پر تشویش کا باعث تھا۔ مونتسکیو کے خیال میں حاکموں کی جانب سے طاقت کے غلط استعمال کا واحد حل یا تریاق چیک اینڈ بیلنس کا نظام تھا: ایک متوازن طاقت کے ساتھ طاقت وروں پر نظر رکھنا۔ اور چالیس سال بعد ان خیالات نے ریاست ہائے متحدہ کے نئے آئین میں جگہ پائی جس میں اختیارات سے علیحدگی، الیکٹورل کالجز، اختیارات کی حدود اور دیگر ذرائع شامل تھے جن کا مقصد ایک محدود نمائندہ حکومت بنانا تھا۔ (اگرچہ یہ سیاسی حقوق اور تحفظات اس وقت وہاں رہنے والے 800,000 یا اس سے زیادہ غلاموں اور مقامی لوگوں کو نہیں دیئے گئے)۔

فرانس میں ایک بار پھر حالات مختلف تھے۔ وہاں، 1789 کے انقلاب کے بعد خوف و دہشت کے دور (94-1793) نے امریکہ کے بانیوں کے اس خدشہ کی تصدیق کر دی کہ جمہوریت کسی بھی وقت افراتفری و انارکی میں بدل سکتی ہے۔ فرانسیسی انقلابیوں کا یہ عقیدہ، کہ ان کی منتخب امر شاہی یا اشرافیہ کی حکومت عوام کی 'عمومی رضامندی' سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے، غلط تھا۔ صرف اختلاف اور بحث تھی اور اس ہمراہ تشدد تھا۔ اسی دہشت گردی نے انگریز پولیٹیکل تھیورسٹ ایڈمنڈ برک (1790) کو اپنی کتاب 'ری فلیکشن آن دی ری ولوشن اِن فرانس' (انقلاب فرانس پر غور/نظر) میں یہ شکایت کرنے پر مجبور کر دیا کہ: "جمہوریت میں شہریوں کی اکثریت اقلیت پر سب سے زیادہ ظالمانہ جبر

کرنے کے قابل ہوتی ہے۔"

لبرل جمہوریت

1835 میں ایک اور فرانسیسی مفکر، ایلکسی ڈی ٹوکاویلا نے ایک کتاب "ڈیموکریس اِن امریکہ" (امریکہ میں جمہوریت) شائع کی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ امریکی جمہوریہ کی ظاہری کامیابی صرف اس کی کمی مرکزیتِ اقتدار (ڈی سنٹرلائزیشن)، اس کے اختیارات کے توازن، اس کی منتقلی اختیار ('وفاقیت')، اور ایسی دیگر آئینی خصوصیات جو اگرچہ بہت اہم تھیں لیکن، ان کی وجہ سے نہیں تھی۔ اس کے خیال میں امریکہ کے اخلاقی اور سماجی کلچر کا بھی اس میں ایک کلیدی کردار تھا۔ سول سوسائٹی (امریکہ میں گرجا گھروں، خیراتی اداروں، کلبوں، سیلف ہیلپ (اپنی مدد آپ) گروپس، اور کمیونٹی ایسوسی ایشنز کی کثرت تھی) نے ووٹرز کو باشعور اور معتدل بنانے میں اپنا حصہ ڈالا۔ ٹوکاویلا کے مطابق مشترکہ مفاد اور شائستگی جمہوریہ کے ہجوم کی حکمرانی بننے کی راہ میں رکاوٹ ہو سکتی ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کلچر کا حصہ بنیں کہ اس کے بغیر بات نہیں نے گی۔

انیسویں صدی کے عظیم انگریز فلسفی جان اسٹورٹ مِل نے جدید لبرل جمہوریت کے اصول وضع کیے تھے (1861) یونانیوں کی طرح وہ بھی ایک جاہل، متلون مزاج اکثریت کے جبر سے خوفزدہ تھا جس کا مطمح نظر ذاتی مفادات اور کس کی قیادت کرشماتی شخصیت کے حامل بازاری لیڈر کریں۔ نہ ہی اس کی دنیا میں براہ راست جمہوریت ممکن تھی جہاں برادریاں/ کمیونٹیز قدیم ایتھنز سے کہیں زیادہ بڑی تھیں جس کی وجہ سے تمام شہریوں کو یکجا کرنا ناممکن تھا۔ اس کے خیال میں جدید دور کے لیے واحد قابل عمل نظام نمائندہ حکومت ہوگی۔ لیکن نمائندوں کو بھی محض مندوبین نہیں ہونا چاہیے جو صرف اپنے ووٹروں کے تعصبات کو آواز دیں اور اجاگر کریں۔ بلکہ، انہیں آزادانہ اور ذمہ داری سے سوچنا اور کام کرنا چاہئے چاہے اس کا مطلب مقبول عام رائے کو رد کرنا ہی کیوں نا ہو۔ جیسا کہ ایڈمنڈ برک (1774)

نے پہلے اپنی 'اسپیچ ٹو دی الیکٹرز آف برسٹل' میں کہا تھا: 'آپ کا نمائندہ آپ کا مقروض ہے، نہ صرف اس کی صنعت بلکہ اس کے فیصلے بھی؛ اور وہ آپ کی خدمت کے بجائے خیانت کرتا ہے اگر وہ اسے (یعنی اپنے فیصلے یا رائے کو) آپ کی رائے پر قربان کر دے۔'

بہر کیف مِل کا اصرار ہے کہ کسی بھی نظامِ حکومت میں افراد کے حقوق اور آزادی سب سے پہلے آتی ہے جن کا تحفظ ضروری ہے۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ حقوق ایک طرح سے خدا کے عطا کردہ یا ہماری فطرت کا حصہ ہیں، جیسا کہ لاک اور امریکیوں کا خیال تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ وہ اخلاقی اصول ہیں جن کی ہم پیروی کرتے ہیں کیونکہ یہ بروئے کار آتے ہیں، ان سے کام بن جاتا ہے۔ اور کوئی حکومت صرف اسی صورت میں چل اور پائیدار ہو سکتی ہے جب وہ ان حقوق کا احترام کرے اور اپنے شہریوں کی جان، آزادی اور املاک کی حفاظت کرے۔ 'آن لبرٹی' میں، (1859) مِل نے یہ واضح کیا تھا کہ اس کے خیال میں حکومتی مداخلت کتنی حد تک محدود ہونی چاہیے۔ خواہ ایک بہت بھاری اکثریت لوگوں کے اعمال و افعال کو محدود کرنے کے حق میں کیوں نہ ہو (لیکن)، 'واحد مقصد جس کے لیے کسی مہذب کمیونٹی کے کسی بھی فرد کے خلاف، اس کی مرضی کے برعکس، طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے وہ دوسروں کو نقصان سے بچانا ہے۔'

جمہوریت کی توسیع

اب تک لبرل ڈیموکریسی کے اصول یکجا ہونا شروع ہو چکے تھے، اگرچہ خود برطانیہ کی اپنی پارلیمنٹ جمہوریت یا جمہوری کہلانے سے کوسوں دور تھی۔ لیکن انیسویں صدی کے دوران بڑھتی ہوئی لبرل ازم بدعنوان انتخابی نظام کو۔۔۔ جس میں صرف بڑی املاک کے مالک ہی ووٹ دے سکتے تھے، جہاں کچھ زمیندار پورے پارلیمانی اضلاع کو کنٹرول کرتے تھے، اور جہاں رشوت، بدعنوانی اور دھمکیاں عروج پر تھیں۔۔۔ ختم کرنے کے مطالبات کو جنم دے چکی تھی۔ 1832 کے "گریٹ ریفارم ایکٹ" (عظیم

اصلاحی قانون) نے چیزوں کو بہتر بنانے میں مدد کی، حالانکہ اس کا بنیادی اثر ووٹرز یا انتخاب کنندگان کا حلقہ وسیع کرنا تھا، اب چھوٹے زمینداروں اور پٹہ داروں کو بھی ووٹ کا حق دیا گیا۔ 1867 میں ایک اور اصلاحات نے فرنچائز کو مزید وسیع کیا، اور اس میں کام کرنے والے 'معزز' مردوں اور گزارہ حال آمدنی والوں کو شامل کیا گیا۔

انگلستان میں، اور بلاشبہ دیگر کئی ممالک میں بھی، ابھی خواتین کو اُنا حق رائے دہی استعمال کرنے کیلئے مزید کئی سال انتظار کرنا تھا۔ خواتین کے حق رائے دہی کے علمبردار دنیا کے دوسری طرف نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں تھے (حالانکہ 1965 کے آخر تک کچھ ریاستوں میں مقامی آسٹریلوی باشندوں کو اب بھی اس عملسے باہر رکھا گیا تھا)۔ فن لینڈ اور ناروے نے پہلی جنگ عظیم سے بھی قبل خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا۔ آسٹریا، جرمنی، پولینڈ، روس، نیدرلینڈز، امریکہ اور سویڈن نے اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی پیروی کی۔ برطانیہ نے 1918 میں جائیداد رکھنے والی، اور پھر عمومی طور پر 1928 میں خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا۔ لیکن پرتگال اور سوئٹزرلینڈ میں یہ دن دیکھنے کیلئے خواتین کو 1970 کی دہائی تک انتظار کرنا پڑا۔ اور کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں خواتین کو آج بھی انتخابی عمل سے باہر رکھا گیا ہے۔

... اپنی حدود سے آگے؟

فرنچائز کے وسیع ہونے سے، جائیداد والے مردوں سے لے کر تمام شہریوں کی شمولیت تک، نمائندہ حکومت کی قانونی حیثیت میں اضافہ ہوا (جسے اب عالمی سطح پر 'جمہوریت' کہا جاتا ہے) اور اس خیال کو تقویت ملی کہ یہی طریقہ وسیع تر مسائل کے حل کے سلسلے میں بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ اتفاقاً عین اسی دور میں عام خوشحالی میں بھی اضافہ ہوا جس نے اس خیال کو تقویت بخشی کہ فرنچائز (ووٹرز) کو مزید وسعت دی جائے (اگرچہ اس معاشی آسودگی کے پیچھے غالباً مقبول ووٹنگ کی بجائے آزاد تجارت اور کھلی منڈیوں جیسے لبرل نظریات کو اپنانے کا ہاتھ زیادہ تھا)۔

بیسویں صدی کے دوران یہ زیادہ قانونی 'جمہوریت' زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر محیط ہوئی، صحت کی دیکھ بھال، تعلیم، پنشن سیونگ اور خیرات جیسے شعبوں میں انفرادی یا فرد کی پسند وانتخاب کی جگہ اجتماعی انتخاب و پسند نے لے لی۔ جیسے جیسے حکومت پھیلتی گئی مفاد پرست گروہوں کے لیے خصوصی مراعات، گرانٹس، سبسڈی، ٹیکس میں چھوٹ اور دیگر فوائد حاصل کرنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آتے رہے۔ صدی کے آخر تک ایک سیاسی اشرافیہ نے جنم لیا جس میں سیاستدان، لابنگ کرنے والے، این جی اوز، کمیشن، ٹربیونلز، ریگولیٹری ایجنسیوں، نیم سرکاری ادارے (جنہیں سرکاری امداد ملتی مگر جہاں حکومت کے نامد کردہ افراد اعلیٰ عہدوں پر مقرر ہوتے ہیں)، سیاسی میڈیا، تھنک ٹینکس اور دیگر شامل تھے۔ ان کی نظر سے فرد کی زندگی کے چند حصے ہی تھے جو باہر یا مستثنیٰ تھے۔

" تصور کریں کہ اگر پوری زندگی (مطلب اس کے ہر پہلو) کا تعین اکثریت کے اصول سے ہوتا تو ہر کھانا پیزا ہوتا۔ پتلون کا ہر جوڑا۔۔ڈینم (اک برانڈ) کا ہوتا۔ لائبریری کے شیلف میں مشہور شخصیات کی خوراک اور ورزش کی کتابیں ہی پڑی ہوتیں۔پی۔جے۔اوراک (1991)،'پارلیمنٹ آف ہورز'

مرگِ جمہوریت؟

نمائندہ حکومت کی ظاہری قانونی حیثیت کے باوجود کچھ ناقدین اس کو ایک بدترین ناکامی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہم نے جو کچھ بنایا ہے وہ جمہوریت نہیں بلکہ ایک الیکٹیو پاپولسٹ اولیگارکی (انتخاب کا حق رکھنے والی عوامیت پسند اشرافیہ) ہے جس کی خودغرضی، قلیل مدتی توجہ اور بے اصولی حکومت کو بغیر جانچ پڑتال افزائش بیوروکریسی، اقرباپروری اور لاپرواہی سے زیادہ خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی کو اکثریتی رائے کے گرز سے کچلنے کی اجازت دیتی ہے۔ وہ یہ گلہ کرتے ہیں کہ بہت سے عام لوگ یا تو سیاست کو غیر متعلقہ اور یا اپنے قابو سے باہر سمجھتے ہیں، اور ان کی یہ بیگانگی

سیاسی طبقے کے ہاتھوں ان کے استحصال کو مزید آسان بنا دیتی ہے۔ (جیسا کہ پیریکلز نے ایتھنز کے باشندوں سے سے کہا تھا: 'صرف اس وجہ سے کہ آپ سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاست آپ میں دلچسپی نہیں رکھتی۔')

بہرحال نسبتاً لبرل جمہوریتوں میں زندگی اور سیاست پہلے زمانے کی امرشاہی کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزاد اور کھلی رہتی ہے۔ اس کے باوجود جمہوری نظریات کو یقیناً خراب کیا جاسکتا ہے، اور اس کی وجہ صرف غفلت یا نظرانداز کرنا ہی نہیں۔ ہمارے آج کے نام نہاد روشن خیال دور میں بھی وہ حکومتیں جو 'جمہوری' ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، وہ آج بھی عام طور پر دھاندلی، حقِ رائے دہی سے محرومی، سنسرشپ، ضبطگیوں، بے قاعدہ و ظالمانہ گرفتاریوں، عدالتوں کو سیاست زدہ کرنے اور بغیر کسی مقدمے کے نظربندیوں میں مصروف ہیں۔ یہ سب تبدیل کرنا ہے تو پہلی ترجیح یہ ہونی چاہئے کہ یہ واضح ہو کہ جمہوریت کا اصل مطلب کیا ہے اور کون سے ادارے اور اصول اس کی بنیاد بنتے اور اسے سہارا دیتے ہیں۔

جمہوری ادارے

تقریباً تمام حکومتیں جمہوریہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، اس کی قانونی حیثیت سے لطف اندوز ہوتی ہیں لیکن بہت کم اس معیار پر پورا اترتی ہیں۔ مشہور ہے کہ 'جمہوری' حکومتیں انتخابات میں دھاندلی کرتی ہیں، میڈیا کو کنٹرول کر کے تنقید کو روکتی ہیں، مخالفین کو ستانے کے لیے پولیس اور عدالتوں کو استعمال کرتی ہیں، اور خود کو اور اپنے ساتھیوں کو مالامال کرنے کے لیے ریاست کی قانونی اور مالی طاقت کا غلط استعمال کرتی ہیں۔ اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ (2019) کی ایک رپورٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ صرف 22 ممالک کو، جو دنیا کی آبادی کا صرف 5.7 فیصد ہیں، قانونی طور پر 'مکمل' جمہوریت کہا جا سکتا ہے، اور ان میں سے 15 مغربی یورپ میں ہیں۔ درحقیقت، وہ ممالک جو اپنے سرکاری ناموں میں 'عوامی جمہوریہ' لکھتے بولتے ہیں (جیسے الجزائر، ایتھوپیا، شمالی کوریا، لاؤس اور نیپال) وہی آمریت کو عروج و دوام دینے پر تلے ہوتے ہیں۔

اس لیے ہمارے لئے اس بات کا واضح خیال رکھنا ضروری ہے کہ جمہوریت اصل میں کیا ہے، بجائے اس کے کہ ہم آمرانہ حکومتوں کے فریب میں آئیں جو خود کو جان بوجھ کر یا خود فریبی کے باعث جمہوریہ ظاہر کرتی ہیں اور غلط بیانی سے کام لیتی ہیں۔ ہمیں جمہوریت کے بنیادی اصولوں کا نقشہ بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ہم حقیقی اور جعلی جمہوریتوں میں فرق کر سکیں۔

حکومت کا مقصد اور طاقت/اختیار

اس عمل کو شروع کرنے کے لیے ہمیں غالباً پہلے یہ سوال پہلے پوچھنا چاہیے کہ حکومت کا مقصد کیا ہے، اور پھر یہ کہ جمہوریت اس مقصد کی معاون کیسے بن سکتی ہے۔

لاک، مِل اور دیگر لبرل نظریہ دانوں نے جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ انسان سماجی مخلوق ہیں اور زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ گزر بسر کر بھی لیتے ہیں لیکن ان پر اکثر ایسے لوگ زبردستی کر سکتے ہیں جو ان پر غلبہ حاصل کرنے، انہیں لوٹنے یا دھوکہ دینے کے لیے ان کے خلاف طاقت کا استعمال کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ حکومت کا وجود افراد کے ایک منظم نظام انصاف کے ذریعے طاقت کے استعمال کی حوصلہ شکنی کے ساتھ اپنی آزادی کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا حکومت کی اپنی کوئی آزاد زندگی اور شناخت نہیں ہے: اس کے وجود کا صرف ایک ہی جواز ہے اور وہ شہریوں کا تحفظ اور ان کی آزادی کی حفاظت ہے۔

شہریوں کو ان مقاصد کے حصول کے لیے حکومت کو کچھ اختیارات، مثال کے طور پر مجرموں کو حراست میں لینے اور سزا دینے کے لیے طاقت کے استعمال کی صلاحیت، دینے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ حکومت کے پاس بہت زیادہ طاقت ہونی چاہیے: بلکہ یہ کہ اس کے پاس جو بھی طاقت ہے اسے عوام کی طرف سے استعمال کیا جانا چاہئے۔ حکومتی طاقت کا استعمال ان پر قابو پانے کے لیے نہیں کیا جا سکتا، یوں اس کے پورے مقصد کی نفی ہو جائے گی۔ انتظام متفقہ و باہم رضامندی سے ہونا چاہیے۔ اور چونکہ حکومت کے فیصلے سب پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے ہر ایک کو اس عمل میں شریک ہونا چاہیے، ان کی رائے و نظریات کو یکساں طور پر شمار کیا جائے۔ اس کے لیے فیصلہ سازی کے کسی جمہوری نظام کی ضرورت ہے۔

طاقت بدعنوان (کرپٹ) کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور مطلق طاقت مطلق بدعنوان/کرپٹ کر دیتی ہے۔ عظیم آدمی تقریباً ہمیشہ برے آدمی ہوتے ہیں، یہاں تک کہ جب اختیار کی بجائے وہ اثر و

رسوخ کا ہی استعمال کریں۔ یعنی کسی کے پاس جتنا زیادہ اختیار یا طاقت ہو گی اتنا ہی اس کا بدعنوانی کی طرف میلان ور جحان زیادہ اور یا پھر وہ یقینی طور پر بدعنوان و کرپٹ ہو گا۔

لارڈ ایکٹن (1887)، بشپ کرائٹن کو خط

لیکن چونکہ حکومت کے پاس زبردستی کی طاقت ہے اس لیے یہ خطرہ باقی رہے گا کہ اکثریت والے اس طاقت کو دوسروں کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ دیکھتے ہوئے کہ انسان خودغرض ہیں، ہمیں یہ فرض کرنا چاہیے کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ اٹھارہویں صدی کے سکاٹش فلسفی ڈیوڈ ہیوم (1758) نے خبردار کیا تھا کہ 'نظامِ حکومت کے بندوبست میں ہر آدمی کو مکار و جھوٹا سمجھنا چاہیے، اور اس کا مقصد نجی مفاد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا ہے'۔ دو سو سال بعد جنگ کے دور میں لکھی گئی اپنی کتاب 'دی روڈ ٹو سرف ڈم' میں اینگلو-آسٹریائی مفکر ایف اے ہائیک (1944) نے یہ بیان کیا تھا کہ جمہوریت کتنی آسانی سے مطلق العنان آمریت کے گینگ راج میں بدل سکتی ہے۔ اور درحقیقت 2020 میں کورون کی وبا کے دوران جمہوری ممالک کے بہت سے شہری اپنے سیاستدانوں کے ان اختیارات کو دیکھ کر حیران رہ گئے جن کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے شہری کی روزمرہ کی زندگی کے طرزِ عمل پر زبردست پابندیاں عائد کیں۔

اگر کڑی نظر نہ رکھی جائے تو اکثریت کی حکمرانی اقلیتوں اور افراد کو برسراقتدار اکثریت کے مفادات کے آگے کوئی تحفظ نہیں دیتی۔ پس ایک محدود، لبرل جمہوریت کے لیے ایک آواز اٹھائی جا رہی ہے جس میں افراد کی آزادی اور ان کے بنیادی حقوق ہمیشہ اکثریتی فیصلے سے بالاتر ہوتے ہیں، اور جہاں حکومت صرف ان حقوق کے تحفظ کے لیے ہی مداخلت کرتی ہے (بٹلر 2013)۔ یہ حدود باضابطہ طور پر آئین میں بیان کی جا سکتی ہیں۔

تاہم، کچھ نظریہ سازوں کا خیال ہے کہ جمہوریت کے جبر کی طرف بڑھنے کا خطرہ، اگرچہ حقیقی ہے لیکن، مبالغہ آرائی ہے۔ مثال کے طور پر ترک نژاد امریکی ماہر اقتصادیات ڈارون آسیمو گلو اور ان کے

برطانوی ساتھی جیمز رابنسن (2006) نے جانا کہ جہاں سیاسی ادارے، معاشی نظام اور سول سوسائٹی مضبوط ہوں وہاں جمہوریت زندہ رہ سکتی ہے اور زندہ رہتی ہے۔ اسی طرح سیاسیات کے سائنس دانوں آندرے الویز اور جان میڈو کرافٹ (2014) نے پایا کہ در حقیقت مخلوط (ریاستی اور نجی) معاشی نظام والی اعتدال پسند جمہوریتیں وسیع اور مستحکم ہوتی ہیں جب کہ مطلق العنان نظام طویل المدتی تناظر میں اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں، وہ کہتے ہیں کہ حکمران گروہ اور اس کے ساتھیوں کی تعداد کی ایک عملی حد ہونی چاہیے کیونکہ استحصال کرنے والے جتنے زیادہ ہوں گے اتنے ہی برائے استحصال کم پیداواری (اور کم پرجوش) شہری ہوں گے۔

جمہوریت کا کلیدی کردار

اس کے ساتھ ساتھ کہ جمہوریت اجتماعی فیصلے کرنے کا ایک منصفانہ طریقہ ہے، نظریہ سازوں نے دیگر وجوہات کی بنا پر بھی اس کی حمایت کی ہے۔ کچھ کا دعویٰ ہے کہ جمہوریت اپنے آپ میں اچھی ہے کیونکہ یہ واحد نظام حکومت ہے جس کی بنیاد اخلاقی اور سیاسی مساوات پر مبنی ہے۔ دوسروں کا کہنا ہے کہ اس سے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں جیسے کہ سماجی شرکت، ذاتی ذمہ داری، امن یا خوشحالی۔ ان سب بارے شواہد پر بحث کی جا سکتی ہے۔

بہر کیف جمہوریت کا ایک واضح فائدہ ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم جمہوریت کو بنیادی طور پر اپنے فیصلہ سازوں کو منتخب کرنے کے طریقے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کی اصل اہمیت انہیں روکنے، اور انہیں پرامن طریقے سے ہٹانے میں ہے۔ آخر کار قانون ساز بھی فرشتے تو نہیں ہوتے: ہم سب کی طرح وہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ طاقت بہ آسانی انہیں راغب اور کرپٹ کر دیتی ہے۔ دفتر میں وہ ہمارے مفاد پر اپنے مفادات کو ترجیح دینا شروع کر سکتے ہیں۔ یا شاید جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، ان کے خیالات (یا ہمارے بھی) بدل جاتے ہیں اور ہمیں لگتا ہے کہ وہ اب مزید ہماری صحیح نمائندگی

نہیں کر سکتے۔ وجہ کچھ بھی ہو، انتخابات میں لوگوں کو عہدے سے ہٹانے کی ہماری اہلیت انہیں طاقت کے حصول اور اس کا غلط استعمال کرنے سے روکنے میں مدد دیتی ہے اور وہ اس عوام پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ جیسا کہ بیسویں صدی کے اینگلو آسٹریائی فلسفی سر کارل پوپر (1945) نے کہا ہے: "ایسی حکومت حاصل کرنا بالکل بھی آسان نہیں ہے جس کی بھلائی اور حکمت پر کوئی مکمل بھروسہ کرسکے۔ [یہ] ہمیں اس سوال 'کس کو حکومت کرنی چاہیئے؟' کی جگہ یہ نیا سوال پوچھنے پر مجبور کرتی ہے کہ ہم سیاسی اداروں کو کیسے منظم کریں کہ برے یا نااہل حکمرانوں کو بہت زیادہ نقصان کرنے سے روکا جاسکے؟"

براہ راست جمہوریت

جمہوریت، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، براہ راست یا نمائندہ ہو سکتی ہے۔ براہ راست جمہوریت میں عام عوام سیاسی مسائل (جیسے ٹیکس کی شرح، دفاع یا فلاحی پالیسی) پر براہ راست فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن آج کل براہ راست جمہوریت نایاب ہے۔

ایک جگہ جہاں براہ راست جمہوریت زندہ ہے وہ سوئٹزرلینڈ ہے۔ وہاں زیادہ تر سیاسی طاقت وفاقی حکومت کے بجائے 27 علاقائی اضلاع (کینٹن) اور 3,000 قصبات یا پنچائیتوں (کمیون) کے پاس ہوتی ہے۔ علاقائی اضلاع سائز میں، زیورخ سے لے کر جس کی آبادی 1.5 ملین ہے سولہ ہزار آبادی کے حامل Appenzell Innerhoden تک، مختلف ہوتے ہیں۔ ریفرنڈم عام ہیں اور چھوٹے اضلاع میں شہریوں کی اسمبلیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور مثال نیو انگلینڈ کے تقریباً 1,000 قصبوں میں منعقد ہونے والی ٹاؤن میٹنگز ہیں۔ سترہویں صدی میں واپس جائیں تو ان اسمبلیوں کے پاس مقامی معاملات جیسے کہ شاہراہوں، لائسنسنگ اور بجٹ پر فیصلہ سازی کا اختیار تھا، اگرچہ ان کا صحیح دائرہ اختیار مختلف ہوتا ہے۔ تاہم کچھ نمائندہ اداروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ بڑے

شہر ٹاؤن میٹنگز میں شرکت کے لیے مندوبین کا انتخاب کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ ہر کوئی شرکت کرے۔ اور جدید قومی ریاستیں بھی اتنی بڑی ہیں کہ شہریوں کو قانون سازی کیلئے اسمبلیوں میں جمع نہیں کیا جاسکتا۔ وہ شاید کبھی کبھار ریفرنڈم کریں جس میں تمام ووٹرز کسی خاص مسئلے پر ووٹ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ کسی جدید ریاست کو درپیش پیچیدہ مسائل پر تفصیلی فیصلے کرنے کا ایک پیچیدہ طریقہ ہے۔

کچھ کارکنوں کا کہنا ہے کہ جدید جمہوریت کو آن لائن ووٹنگ کے ذریعے مزید براہ راست بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس بات کی حد ہونی چاہیے کہ اکثریت کیا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اور اس بارے شکوک و شبہات ہیں کہ کیا عوام پالیسیوں پر تحقیق کرنے اور مشکل سیاسی فیصلوں کا مستقل سلسلہ لینے میں کافی دلچسپی لیتے ہیں اور کیا ان میں یہ صلاحیت موجود ہے۔

نمائندہ جمہوریت

اس طرح کی وجوہات کی بناء پر موجودہ معمول نمائندہ جمہوریت ہے جہاں عوام عام طور پر خود قوانین نہیں بناتے بلکہ اپنی طرف سے قوانین اور پالیسیوں کا فیصلہ کرنے کے لیے نمائندوں (جیسے میئرز، پارلیمنٹیرینز اور صدور) کو منتخب کرتے ہیں۔

ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ حقیقی جمہوریت بالکل بھی نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے گھر کو رنگ دینے کیلئے پینٹر کی خدمات حاصل کرنے اور گھر کو خود پینٹ کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ اور یہ کہ عوام کا کردار محض ان لوگوں کے انتخاب تک محدود ہوتا ہے جو امور حکومت چلائیں گے۔ لیکن کم از کم عوام اس انتخاب میں شامل ہوتے ہیں، بجائے اس کے کہ ان پر حکمران مسلط ہوں۔ اور وہ مزید گہری شمولیت جیسے کہ کرسی کے لیے کھڑا ہونے اور جاری عوامی بحث میں حصہ لینے کیلئے آزاد ہوتے ہیں یعنی وہ چاہیں تو وہ انتخاب لڑیا پھر کسی معاملہ پر اپنی رائے دے سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سے نمائندہ نظام آج بھی براہ راست عوامی کنٹرول کے عناصر کو برقرار رکھے

ہوئے ہیں، جیسے کہ ریفرنڈم (جہاں عام عوام کلیدی مسائل پر ووٹ دیتے ہیں)، درخواستیں اور اقدامات (جہاں ووٹروں کے گروپ پارلیمنٹ کو کسی معاملہ پر ووٹ ڈالنے پر مجبور یا ریفرنڈم کا مطالبہ کر سکتے ہیں)، دورانیہ/مدت کی حد (جہاں نمائندے ایک مقررہ وقت سے زیادہ عرصہ کے لیے عہدے پر فائز نہیں رہ سکتے ہیں)، اور پلٹانا/واپس بلانا (جہاں ووٹر کسی نمائندے کو دفتر سے نکال سکتے ہیں)۔ لیکن عام طور پر، بہت سے ووٹر ہر مسئلے پر خود غور کرنے کی بجائے روزمرہ کی سیاست کو ان لوگوں پر چھوڑنا پسند کرتے ہیں جن کے پاس زیادہ وقت، فیصلہ/رائے اور دلچسپی ہوتی ہے۔

لہٰذا آج جب لوگ "جمہوریت" کی بات کرتے ہیں تو ان کا مطلب عام طور پر نمائندہ حکومت ہوتی ہے، اور یہ اس لفظ کے جدید معنی بن گئے ہیں۔ تاہم اس لفظ کا یہ استعمال یقینی طور پر الجھن پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک لفظ میں مختلف نظاموں کی وسیع اقسام کو سموتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ براہ راست جمہوریت کی خوبیاں (جیسے قانون سازی میں عوامی شرکت) نمائندہ نظاموں میں بھی موجود ہیں اگرچہ کچھ ایسے نظاموں میں عام عوام کو رائے دینے کی بہت کم یا کوئی حقیقی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

لبرل جمہوریت

کئی طرح کے نمائندہ نظاموں میں سے ایک لبرل جمہوریت ہے۔ لبرل جمہوریتیں وہ نمائندہ نظام ہیں جو کلاسیکی لبرل اصولوں کے تابع ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ذاتی حقوق جیسے انسانی جان، آزادی اور جائیداد کے حقوق کا ہمیشہ احترام کیا جانا چاہیے: کوئی بھی 'جمہوری' فیصلہ ان کو زیر نہیں کر سکتا یا ان سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ لیکن زیادہ وسیع معنوں میں، جن ممالک کو اکثر لبرل جمہوریت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے عام طور پر ان میں دیگر خصوصیات۔۔۔ جو اس تحفظ کے حصول میں ممد ہوتی ہیں جیسے کہ فیصلے کرنے کے طریقہ کار کے قبول شدہ قانونی قواعد، حکومت کیلئے آئینی حدود، قانون سازی اور انتظامی طاقت کی علیحد گی، اور ایک آزاد انصاف کا نظام۔۔۔ مشترک ہوتی ہیں، وہ

آزاد اور منصفانہ انتخابات جن میں کوئی بھی عہدے کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے، مسابقتی جماعتوں، آزاد میڈیا، اور کھلی سیاسی بحث جیسے عوامی معاملات میں عوامی شرکت کے لیے بھی کھلے رہتے ہیں۔

اس سے آگے وہ کئی حوالوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ نسبتاً لبرل جمہوریت کی کچھ مثالیں آئینی بادشاہتیں ہیں (مثال کے طور پر ڈنمارک، جاپان، اسپین اور برطانیہ) جہاں سربراہ برائے نام بادشاہ ہوتا ہے، لیکن ایک ایسا بادشاہ جس کی طاقت آئینی قوانین کی بدولت محدود ہوتی ہے۔ دیگر جمہوریہ ہیں (مثال کے طور پر فرانس، آئرلینڈ اور امریکہ) جہاں لیڈر منتخب ہوتے ہیں، لیکن ان کی طاقت بھی آئینی طور پر محدود ہوتی ہے۔ اور ہر نظام میں مختلف آئینی عناصر جیسے سربراہ مملکت (مثال کے طور پر، بادشاہ یا صدر) اور مختلف پارلیمانی چیمبرز (مثال کے طور پر سینیٹ یا ایوانِ نمائندگان) اور حکومت کی شاخوں (انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ) کے پاس مختلف قسم کے اختیارات ہو سکتے ہیں۔

لیکن ایک موثر لبرل جمہوریت آسان نہیں ہے۔ اسے کس طرح کام کرنا چاہئے اور اسے اکثریتی فیصلہ سازی پر کن حقوق اور آزادیوں کو ترجیح دینی چاہئے، یہ پیچیدہ اور متنازعہ سوالات ہیں۔ مثال کے طور پر یہ واضح نظر آتا ہے کہ لبرل جمہوریت میں اکثریت کو اختیار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی ایسی اقلیت کو من مانی کر کے گرفتار، قید یا جلاوطن کرے جس سے وہ متفق نہیں ہیں۔ لیکن فرض کریں کریں کیا وہ اقلیتوں پر قانونی طور پر ٹیکس لگا سکتے ہیں، اور امیر لوگوں پر زیادہ ٹیکس لگا سکتے ہیں؟ کیا انہیں لوگوں کے طرز زندگی میں مداخلت کرنے کی اجازت ہے (جیسے کہ ان کے منشیات، الکحل یا چینی کے استعمال کو محدود کرنا) تاکہ شہریوں کو خود کو نقصان پہنچانے سے بچایا جا سکے؟ یا قومی مفاد میں لوگوں کے معاشی انتخاب (جیسے وہ کہاں رہتے ہیں یا کیا کام کرتے ہیں) کا حکم دیتے ہیں؟ کیا لبرل جمہوریت میں حکام کو جنگ یا وبائی امراض کے وقت بعض آزادیوں کو معطل کرنے کے قابل ہونا چاہیے، یا دہشت گردی کے خطرے سے نمٹنے کے لیے اپنے شہریوں کی جاسوسی کرنی چاہیے؟

ایسے سوالات کا کوئی سادہ، ہاں ناں میں جواب نہیں ہے۔ اگرچہ لبرل جمہوریت قابل ذکر حد تک لچکدار

ہوتی ہے، لیکن اس کا مستقبل صرف اسی صورت میں یقینی بنایا جا سکتا ہے جب اس کے ان بنیادی اصولوں بارے فہم عام ہو جو اسے سہارا دیتے ہیں۔

جمہوریت کے اصول

لبرل جمہوریت کے لوازمات

جب ہم ان ممالک کو دیکھتے ہیں جنہیں اکثر لبرل جمہوریت کی مثالوں کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، تو کچھ خصوصیات اور ادارے نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔

وسیع فرنچائز۔ لبرل جمہوریت کی بنیاد وسیع حق رائے دہی اور مساوی سیاسی حیثیت پر قائم ہے: تقریباً تمام بالغ افراد ووٹ ڈالنے کے اہل ہیں اور ان کے ووٹوں کی گنتی یکساں ہے۔ سنگین ذہنی معذوری والے بچوں اور بالغوں کو ووٹ دینے کے لیے نااہل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور کچھ ممالک میں جیل کے قیدیوں (اور یہاں تک کہ رہائی پانے والے مجرموں) کو اس بنیاد پر خارج کیا جاسکتا ہے کہ اپنے جرائم کی وجہ سے وہ سماجی معاملات میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں۔ بصورت دیگر تمام شہری (اس عمل میں) شامل یا شریک ہوتے ہیں۔

تاہم شہری کے طور پر کون شمار ہوتا ہے یہ ایک قابل بحث موضوع ہے۔ کبھی صرف جائیداد والے مردوں کو ہی یہ سوچ کر ذمہ داری سے ووٹ ڈالنے کا اہل سمجھا جاتا کہ ملک میں ان کا کافی کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اسی طرح کی وجوہات کی بنا پر آج کچھ بھی لوگ حالیہ تارکین وطن اور عارضی رہائشیوں کو ووٹ کا حق دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ایک علاقے میں مختلف آبادیاں ہو سکتی ہیں، جو اپنے قومیت کے احساس (مثال کے طور پر یوکرین میں روسی)، زبان (مثال کے طور پر کینیڈا میں فرانسیسی بولنے والے)، نسل

(مثال کے طور پر جنوبی افریقہ میں)، یا مذہب (مثال کے طور پر، صومالیہ، بوسنیا، عراق، پاکستان اور بہت سے دوسرے ممالک میں) کی بنیاد پر الگ الگ ہو سکتی ہیں۔ ہر گروہ دوسروں کے ایسے اجتماعی فیصلے کرنے کے حق کو مسترد کر سکتا ہے جو ان پر اثرانداز ہوں۔ لبرل اصول شہریت کی ممکنہ حد تک جامع تعریف کریں گے۔ لیکن شہریت کے قوانین بھی واضح اور عام طور پر تسلیم شدہ ہونے چاہئیں، ایسا کرنا شاید مشکل ہو۔

کھلے انتخابات۔ لبرل جمہوریتیں کسی کو بھی عوامی عہدے کے لیے انتخاب لڑنے کی اجازت دیتی ہیں۔ ایک بار پھر، بچے، قیدی یا ذہنی معذوری کے حامل افراد کو خارج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لوگوں کو ان کی مخصوص پارٹی، مذہب، طبقے، خاندان، نسلی گروہ یا جنس کی وجہ سے امیدواروں کے طور پر خارج نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی اقتدار میں رہنے والے اپنے مخالفین کے حوالے سے یہ فیصلہ کرنے کے حقدار ہیں کہ وہ عہدے کے لیے نااہل ہیں۔ ایک لبرل جمہوریت اپنے شہریوں پر اعتماد کرتی ہے کہ وہ اپنے فیصلے خود کریں کہ کون ان کی نمائندگی کے لیے موزوں ہے۔

لبرل جمہوریت میں انتخابات متواتر، آزادانہ اور منصفانہ ہوتے ہیں۔ تعدد کے لحاظ سے، مطلب کسی عہدے یا دفتر کیلئے کتنا عرصہ بعد انتخابات ہونے چاہئیں اس بارے مختلف ممالک میں مختلف خیالات ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ ہر دو سال بعد نمائندے، ہر چار سال میں صدر اور ہر چھ میں سینیٹرز کا انتخاب کرتا ہے۔ فرانس ہر سات سال بعد اپنا صدر منتخب کرتا ہے یہاں تک کہ 2000 کے ریفرنڈم نے اس مدت کو کم کر کے پانچ سال کر دیا۔ اور بہت سی جگہوں پر یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ کوئی ایک عہدہ کتنی بار سنبھال سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انتخابات کافی متواتر ہوں، اور عہدہ کی مدت کافی مختصر، اول اس لئے کہ کسی کو مطلق العنان حکمران بننے سے روکا جا سکے، اور دوئم شکست خوردہ فریق کو یہ باور کرانے کے لیے کہ تشدد کا سہارا لینے کے بجائے اگلے انتخابات تک پرامن طریقے سے انتظار کرنا مناسب ہے۔

آزاد انتخابات وہ ہوتے ہیں جہاں ووٹر ووٹ ڈال سکتے ہیں، اور بغیر کسی خوف کے یہ انتخاب کر سکتے ہیں کہ کس کو ووٹ دینا ہے۔ اس کے لئے حقیقی خفیہ رائے شماری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لبرل جمہوریتیں اکثر، یہ یقینی بنانے کیلئے کہ ان شرائط کو پورا کیا جائے، نگرانی کے آزاد و خود مختار پینل کی خدمات لیتی ہیں۔

منصفانہ انتخابات وہ ہوتے ہیں جہاں افراد اور پارٹیوں کو الیکشن لڑنے، مہم چلانے اور پر امن میٹنگ کرنے کا مساوی حق حاصل ہوتا ہے، جہاں انتخابی حدود کا فیصلہ آزاد پینلز کے ذریعے معروضی طور پر کیا جاتا ہے (اقتدار میں موجود سیاستدانوں کی طرف سے نہیں)، جہاں ووٹوں کی درست گنتی کی جاتی ہے اور جہاں وہی ووٹ نتیجے کا تعین کرتے ہیں۔ اس کے باوجود 'منصفانہ' کی تعریف اور خصوصیات کے بارے میں ممالک کے مختلف خیالات و نظریات ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں انتخابی اخراجات کی حد تو مقرر ہے لیکن سیاسی جماعتوں کو عطیات کی نہیں۔ جبکہ امریکہ میں عطیات کی حد تو مقرر ہے لیکن اخراجات کرنے کی نہیں۔

آزاد بحث۔ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات صرف اسی صورت میں کام کرتے ہیں جب مسائل کو آزادانہ طور پر اٹھایا جائے اور ان پر بحث کی جائے۔ اس کا مطلب اظہار رائے کا حق ہے۔ ایسا حق کہ فرد بر سر اقتدار حلقوں یا لوگوں پر بھی تنقید کرے اور اس پر بغاوت کا الزام لگے نہ اسے ڈرایا دھمکایا جائے۔ اس کا مطلب ایک آزاد میڈیا ہے، نہ کہ ریاست کے زیر کنٹرول میڈیا جو مقتدر حلقوں کے مفاد کو تحفظ دینے کیلئے کام کرے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگ حکومت کے بارے میں درست معلومات تک رسائی حاصل کر سکیں، نہ کہ سرکاری معلومات پر ریاست کی اجارہ داری ہو۔

ایماندارانہ/دیانتدارانہ نمائندگی۔ عہدہ سنبھالنے والوں کو عوام کے سامنے حقیقی طور پر جوابدہ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے آزاد اور غیر جانبدار عدالتیں ہوں، جج اور اہلکار ہوں کہ جن سے شہری اپیل کر سکیں اگر وہ سمجھتے ہیں کہ نمائندے اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہے ہیں یا لوگوں کے حقوق کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کے ووٹرز کو ایسا لگے کہ انہوں نے اپنے عہدے کا غلط استعمال کیا

ہے تو قانون سازوں کو کسی بھی وقت اپنے عہدوں سے ہٹانے کی دفعات بھی ہونی چاہئیں۔
اور انتخابات کے بنیادی مقصد کے مطابق نمائندوں کو انتخابی نتائج کا احترام کرنا چاہیے اور جب ان کے خلاف ووٹ ڈالے جائیں تو دستبردار ہونے کے لیے تیار رہیں۔ آخر کار لبرل جمہوریت کا ایک مقصد سیاسی تبدیلیوں کو ممکن اور پرامن بنانا بھی ہے۔ ریاستی طاقت کو عہدہ برقرار رکھنے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس اسے ووٹرز کے انتخاب کا احترام یقینی بنانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔
حقوق اور اصول۔ یہ بھی اہم ہے کہ افراد کے بنیادی حقوق معلوم ہوں، عام طور پر قابل قبول ہوں، ان کا احترام، اور قانونی طور پر اس کی ضمانت دی گئی ہو کہ کوئی انتخابی اکثریت ان کو زیر، خارج یا ٹھکرا نہیں سکتی۔ چاہے ان حقوق کو انسان کے ایک موروثی حصے کے طور پر دیکھا جائے، یا ان کو اس لیے اپنایا جائے کہ وہ بروئے کار آتے ہیں، جو صورت ہو کم از کم اس پر اتفاق ہونا چاہیے کہ لوگوں کو کیا حقوق حاصل ہونے چاہئیں، اور ان کے تحفظ کے لیے ایک عمومی عزم ہونا چاہیے۔
یقینی طور پر مختلف لبرل جمہوریتوں کے خیالات ان بنیادی حقوق کے بارے میں قدرے مختلف ہیں۔ سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ہر ایک کو جینے کا، آزادی کا، ذاتی خوشی کے حصول کا، اور جائیداد کی ملکیت کا حق ہے۔ لیکن قطعی اصول مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کو اپنی زمین پر کیا تعمیر کرنے کی اجازت ہے کیا نہیں، یا ایسے جرائم جو حکام کو آپ کو قید کرنے کا جواز فراہم کر سکتے ہیں۔
آئین۔ زیادہ تر لبرل جمہوریتوں نے ایسے آئین لکھے ہیں جو لوگوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرتے ہیں، انتخابی طاقت کی حدود کو متعین کرتے ہیں اور اسے کنٹرول میں رکھنے کے لیے اختیارات کی علیحدگی جیسے میکانزم فراہم کرتے ہیں۔ تاہم، ممکن ہے کہ آئین ایک دستاویز کے طور پر موجود نہ ہو: مثال کے طور پر برطانیہ میں میگنا کارٹا کے مختلف قوانین اور کنونشنز بذریعہ 'بل آف رائٹس ٹو دی پارلیمنٹ ایکٹ' اور 'ڈیوولوشن ایکٹس' لوگوں کے بنیادی حقوق، اور اس امر حکومت کو کیسے کام کرنا چاہیے، کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اکثریت اس طرح کے تحفظات کو پیروں تلے روند نہ سکے، زیادہ تر آئینوں میں ترمیم کرنے سے پہلے بڑی اکثریت اور محتاط عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکی آئین میں ترامیم کے لیے سینیٹ اور ایوان نمائندگان میں دو تہائی اکثریت کے علاوہ ریاستی قانون سازوں کے تین چوتھائی کی منظوری درکار ہوتی ہے۔ برطانیہ ایک استثنیٰ ہے: نظریاتی طور پر پارلیمنٹ اپنے آئینی ڈھانچے کے کسی بھی حصے میں ترمیم کرسکتی ہے حالانکہ عام طور پر ایسی کوئی بھی تجویز بہت طویل اور سخت عوامی بحث سے مشروط ہوتی ہے۔

بالآخر، ایک تحریری آئین بھی بہرحال انفرادی حقوق اور آزادیوں کا تحفظ نہیں کرے گا: اس کے لیے عام آبادی میں گہری ثقافتی اور فکری وابستگی کی ضرورت ہے۔

لبرل نمائندگی کے مطلوبہ عناصر

شرکت۔ ان ضروری خصوصیات کے علاوہ اور بھی مطلوبہ خصوصیات ہیں۔ مثال کے طور پر، جمہوری عمل میں وسیع، فعال اور رضاکارانہ شرکت کا کلچر حصول فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔ یہ مختلف خیالات کو نشر کرنے کی اجازت دیتے ہوئے اس عمل کی قانونی حیثیت میں اضافہ کرتا ہے اگرچہ لبرل اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جو چیز جمہوریت کو قانونی حیثیت دیتی ہے وہ سیاسی مشغولیت یا شرکت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا نہیں بلکہ فرد کی آزادی اور تحفظ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنا/یقینی بنانا ہے۔

امیدوار۔ جمہوریت میں سیاسی جماعتوں کا کردار بڑا اہم ہے کیونکہ ان کی حیثیت ایک معروف شناخت یا 'برانڈ' کی طرح جس کے ساتھ وابستہ رہا جاسکتا ہے یا جنہیں سپورٹ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم ادھر بھی ایک توازن کی ضرورت ہے۔ اگر پارٹیاں اپنے ارکان کو بہت سختی سے کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہیں (مثال کے طور پر ہر امیدوار کے انتخابی پلیٹ فارم کو 'ڈکٹیٹ' کرنا یعنی اپنے اشاروں پر چلانا، اور پارلیمنٹ میں ان کے ووٹ پر مکمل کنٹرول رکھنا، مطلب جدھر جماعت چاہے ادھر ہی ارکان کے

ووٹ پڑیں) تو امیدوار اپنی آزادی کھو دیتے ہیں اور عوام کی انتخابی فیصلے کی اہلیت محدود ہو جاتی ہے۔ اس کی روک تھام کیلئے ضرور ہے کہ امیدواروں کا انتخاب کھلے عام ہونا چاہیے نہ کہ پارٹی کی جانب سے منظور شدہ امیدواروں کی فہرستوں کے ذریعے (جو سیاست پر پارٹی کے اندرونی افراد کی گرفت کو مزید مضبوط کرتے ہیں)۔

وفاقیت۔ مثالی طور پر، فیصلہ سازی کے اختیار کو ممکنہ حد تک نچلی سطح پر منتقل کیا جانا چاہیے، تاکہ انتخاب کرنے والے وہ ہوں جو ان فیصلوں سے متاثر ہوتے ہوں، نہ کہ دور دراز کے وہ لوگ فیصلے کریں جنہیں مقامی حالات و صورتحال کی بہت کم سمجھ ہو۔ لیکن مقامی فیصلوں پر بھی ایک تک مرکزی پابندی یا روک ٹوک ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی مخصوص علاقے پر کسی نسلی یا مذہبی گروہ کا غلبہ ہے، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، تو اقلیتیں اکثریت کے مظالم، زور زبردستی کا شکار ہو سکتی ہیں۔ ایک بڑے علاقے میں اس امر کا امکان زیادہ ہے کہ رائے عامہ ملی جی ہو اور اس لیے وہاں اقلیتوں کے احترام اور تحفظ کا بھی امکان زیادہ ہوتا ہے۔

شہری رواداری۔ تاہم ان سب کی بنیاد پر لبرل جمہوریت وہاں بہترین کام کرتی ہے جہاں متنوع نظریات کو برداشت کیا جاتا ہو، اور جہاں سماجی و اقتصادی استحکام اور امن ہو۔

یہ ایک سوالیہ نشان ہے کہ ان مطلوبہ خصوصیات میں سے کتنی ان ممالک کی اکثریت پر غالب ہیں جو آج 'جمہوری' ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

لبرل جمہوریت کا کام/عمل

انصاف۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے لبرل جمہوریت کا بنیادی مقصد ہی شخصی آزادی کا دفاع اور اسے وسعت دینا اور افراد کو جبر سے بچانا موجود ہے۔ اس لیے اس کے لیے ایک نظام انصاف کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ کسی بھی جانب سے، بشمول ان کے جو برسر اقتدار ہوں، دھوکہ دہی اور طاقت کے

استعمال کو روکے اور اس پر سزا دے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ قوانین اصولی، واضح اور نسبتاً مستحکم ہوں تاکہ انہیں عام طور پر سمجھا جاسکے۔ قوانین ایسے ہوں جن کو قیاس کیا جاسکے نہ کہ بے قاعدہ اور غیر متوقع ہوں، اور ایسے کہ ان کی اطاعت یا ان کا نفاذ بھی ممکن ہو۔ انصاف کا عمل خود بھی اصولی اور متوقع/قابل قیاس ہونا چاہیے۔ جس میں 'قانون کے مطابق عمل' کی پیروی ہو۔ (مثال کے طور پر) قانون نافذ کرنے والے ادارے بغیر کسی جائز و قانونی جواز کے گرفتار اور نظربند نہ کریں۔ اور ملزمان کو اپنے خلاف الزامات جاننے کا حق حاصل ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک منصفانہ ٹرائل کے دوران وہ الزام لگانے والوں کا سامنا بھی کریں۔ ملزمان دورانِ منصفانہ ٹرائل خاموش رہیں، (لیکن یہ خاموشی) ان کے خلاف بطور ثبوت شمار نہ کی۔ (مطلب خاموش ہیں تو مجرم ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔)

انفرادی حقوق اور آزادیوں کے مزید تحفظ کے لیے پولیس، عدالتوں اور ججوں کو آزاد و خود مختار ہونا چاہیے نہ کہ وہ اقتدار میں رہنے والوں کے مفادات کے زیر کنٹرول ہوں اور یا ان مفادات کو فروغ دیتے پھریں۔ مثال کے طور پر اگر حکمرانوں پر عوامی رقوم چوری کرنے کا شبہ ہے تو نظام انصاف بے خوف ہو کر مناسب انکوائریاں اور قانونی چارہ جوئی کرے۔ اور اگر حکمران اپنے مفادات کے لیے آئین میں ردوبدل یا اس کی غلط تشریح کرنا چاہیں تو اس کی بھی روک تھام یا سامنا کرے۔ (مطلب نظام انصاف ان کی راہ میں رکاوٹ بنے)۔

جائیداد کے حقوق۔ لبرل جمہوریت جائیداد کی ملکیت اور استعمال کو نہ صرف ایک بنیادی حق بلکہ جبر کے خلاف ایک گڑھ/قلعے اور معاشی ترقی کے ایک محرک کے طور پر دیکھتی ہے۔ ایک شخص جس نے جائیداد بنانے میں وقت اور توانائی صرف کی ہو اسے ہی اس کے استعمال اور اس سے لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہے۔ اس لیے نظام عدل لوگوں کی املاک کی حفاظت کرتا ہے جیسا کہ یہ ان کی ذات کی حفاظت کرتا ہے۔ مختلف ممالک کے درمیان قطعی قوانین مختلف ہوسکتے ہیں لیکن افراد کو اس قبل ہونا

چاہیے کہ دوسروں کو اپنی جائیداد استعمال کرنے سے روکے، اپنی جائیداد کو آزادانہ طور پر استعمال کرے، اور تحفہ یا فروخت کے ذریعے آگے منتقل کرے۔ یہ قوانین عدالتوں میں بھی قابل اطلاق ہونے چاہئیں۔

ٹیکس لگانا۔ آزادی کے تحفظ کے لیے دفاع اور انصاف کے نظام کی ضرورت ہوتی ہے، اور ٹیکس ان کی ادائیگی کا ایک معقول طریقہ لگتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی جائیداد، اس معاملے میں ان کا پیسہ، ان سے ایک ایسی ریاست لے جس نے اسے محفوظ رکھنا ہے۔ رضا کارانہ عطیات پر بھروسہ کرنے سے 'مفت سوار' کا مسئلہ سامنے آسکتا ہے جہاں کچھ لوگ بغیر ادائیگی/ایک دھیلہ خرچ کئے بغیر ریاستوں کی خدمات سے لطف اندوز ہوں گے۔ اگر لازمی ادائیگیاں ہی واحد قابل عمل آپشن ہیں تو ایک لبرل جمہوریت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور صرف شہریوں کے حقوق اور تحفظ کے لیے استعمال ہوں۔ تاہم، جس آسانی کے ساتھ کوئی اکثریت اقلیتوں (جیسے 'امیر') کا استحصال کرنے کے لیے ٹیکس کا استعمال کر سکتی ہے اس نے امریکی سیاسی ماہرین اقتصادیات جیفری برینن اور جیمز بکانن (1980) جیسے کچھ لبرلز کو یہ دلیل پیش کرنے پر مجبور کیا کہ ٹیکس کو سائز میں محدود ہونا چاہیے، ایسے تشکیل دیا جائے کہ غلط اس کے استعمال کو روکا جاسکے، اور تقریباً متفقہ رضامندی کے ساتھ ہی لیا/شروع کیا جائے۔

ذاتی/شخصی آزادی۔ جیسا کہ جان اسٹورٹ مل نے نشاندہی بھی کی، حکومتوں کو لوگوں کی زندگیوں، آزادیوں اور املاک پر کوئی اختیار نہیں ہے سوائے اس کے کہ تحفظ اور آزادی کے محدود مقاصد حاصل کیے جائیں۔ اگر حکومت کا کام آزادی کی حفاظت کرنا ہے تو انفرادی آزادی پر کسی قسم کی پابندی/روک وٹوک کو پیشگی طور پر جائز قرار دینا چاہیے۔ حکومت لوگوں کے اقدامات کو من مانی کرکے یا مکمل غور و فکر کے بغیر روک نہیں سکتی۔

اہم بات یہ ہے کہ عوامی پالیسی پر مکمل غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ افراد کو اپنی مرضی کے مطابق

سوچنے اور بولنے کا، بشمول سنسر شپ یا سزا کے خوف کے بغیر قانون اور حکومت پر تنقید کے، حق ہونا چاہیے۔ انہیں ایک ساتھ جمع ہونے، سیاسی جماعتیں بنانے اور انتخابات میں مہم چلانے کے لیے آزاد ہونا چاہیے۔ یہ چیزیں لبرل جمہوریت کے عمل کے لیے نہایت اہم ہیں۔ ان پر کسی بھی پابندی ایک جامع و وسیع جواز ہونا چاہیے۔

اسی طرح لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل ہونا چاہیے۔ حکومت ہمارے طرز زندگی کو کنٹرول کے لئے نہیں بلکہ ہماری آزادیوں کے تحفظ کے لیے موجود ہے۔ اس کے علاوہ، خیالات اور زندگی گزارنے کے طریقوں میں تنوع سے معاشرے کو بڑھنے، ترقی کرنے اور زندہ رہنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اپنی زندگی کو خود ہی کنٹرول کرنے کی آزادی ذاتی اور اخلاقی ترقی اور سیکھنے کے لیے ضروری ہے۔ حکام کے زیر کنٹرول غیر متحرک و شناخت سے عاری کی ایک قوم شاید ہی ترقی کرے یا بدلتی ہوئی دنیا میں زندہ رہ سکے۔

چونکہ آزادی اور تحفظ (سیکورٹی) حکومت کے بنیادی فرائض ہیں اس لئے ہمیں ایسی حکومت کو ہٹانے کا پورا حق ہے جو انہیں فراہم نہیں کرتی، خاص طور پر جو ان کی فعال طور پر خلاف ورزی کرتی ہے۔ مثالی طور پر ایسا (حکومت کو ہٹانا) پرامن ذرائع سے ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ لبرل جمہوریتوں میں انتخابات ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ حق محفوظ رکھتے ہیں کہ اپنے آپ کو اور اپنی املاک کو دوسروں کے ہاتھوں، یہاں تک کہ ریاست کی جانب سے بھی استحصال سے بچائیں۔ ایک پرامن سیاسی یا سماجی نظم اعتماد، تعاون اور رابطہ/تبادلہ خیال پر مبنی ہوتا ہے: طاقت و جبر سے نہیں، بلکہ آزادی ورضامندی سے۔

معاشی آزادی۔ معاشی آزادی اور شخصی آزادی لازم و ملزوم ہیں۔ معاشی وسائل کو کنٹرول کرنے والی ریاست زندگی کو بھی کنٹرول کرتی ہے۔ ایک ایسی ریاست جو میڈیا کو کنٹرول کرتی ہو، میٹنگ/اجلاس کے مقامات کی مالک ہو، اشاعت کو سنسر کرتی ہو، اور سفر پر پابندی لگاتی ہو وہ عوامی تنقید اور بحث کو بند کر سکتی ہے۔

معاشی وسائل پر سیاسی کنٹرول سے زیادہ معاشی آزادی بہر صورت خوشحالی کا ایک یقینی راستہ ہے۔ جیسا کہ برطانوی مصنف میٹ ریڈلے (2020) بتاتا ہے، اگر اشیاء اور خدمات کو سستا اور بہتر بنانا ہے تو انفرادی اختراع اور انٹرپرینیور شپ (کاروبار)، اور بہت سے ذہنوں کا اطلاق/استعمال ضروری ہے۔ کنٹرول شدہ کے مقابلے میں ایک آزاد معیشت تبدیلی کے ساتھ بہت تیزی سے ایڈجسٹ کر سکتی ہے۔

آج کی نمائندہ جمہوریتیں

پارلیمانی حکومت

قانون سازی اور انتظامی طاقت۔ تاریخ کو دیکھا جائے تو ایک زیادہ عرصہ تک قانون ساز اسمبلیاں اشرافیہ کی تنظیمیں تھیں: یہ خیال کہ ان کا انتخاب عام عوام کی طرف سے ان کی نمائندگی کیلئے کیا جا سکتا ہے زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، برطانیہ کی پارلیمنٹ امراء کی ایک کونسل سے نکلی جس نے بادشاہ کے اقتدار کو روکنے کی کوشش کی۔ دھیرے دھیرے، عام جاگیرداروں کو اراکین کے طور پر شامل کیا گیا لیکن قرون وسطیٰ کی پارلیمانوں کا مقصد پھر بھی عام لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے جائیداد رکھنے والے لوگوں کی بادشاہی طاقت کے خلاف حفاظت کرنا تھا۔

مزید تصادم کے بعد، بادشاہ کی قدیم طاقت کا زیادہ تر حصہ خود پارلیمنٹ نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اور برطانیہ نے اس پارلیمانی حکومت کو، جس میں ایگزیکٹو اور قانون سازی کی طاقت اب بھی الگ نہیں ہے لیکن جہاں وزیراعظم اور وزراء مقننہ میں بیٹھتے ہیں، دوسرے ممالک (بشمول بہت سی سابقہ کالونیاں جو اب دولت مشترکہ میں ہیں) کو برآمد کیا۔

اس ماڈل کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وزراء براہ راست ووٹروں کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ تاہم، پارلیمنٹ میں ایگزیکٹو/انتظامیہ کا ہونا عوام کو ایگزیکٹو کی طاقت سے بچانے کے پارلیمان کے کردار کو کمزور کرتا ہے۔ اس کے برعکس اختیارات کی امریکی طرز کی تقسیم میں ایگزیکٹو کو وسیع تر حلقہ سے منتخب

کیا جاسکتا ہے (مطلب کوئی بھی صدر بن سکتا ہے، اور اس کی طاقت کو ایک آزاد مقننہ کے ذریعے قابو کیا یا جانچا جاسکتا ہے۔ لیکن پھر وزراء عوام سے زیادہ دور اور کم جوابدہ ہو جاتے ہیں۔

یک ایوانی اور دو ایوانی مقننہ۔ زیادہ تر لبرل جمہوریتوں میں دو ایوانوں والی مقننہ نشو و نما پا چکی ہے۔ دو قانون ساز ایوانوں کا فائدہ یہ ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے اعمال پر سوال اٹھا اور اسے روک سکتا ہے۔ قوانین کی منظوری سے قبل ان کے مابین اختلافات کو ختم کرنا ہوتا ہے جس سے افراد یا چھوٹے گروہوں کے حقوق کو غصب کرنا یا ان کا استحصال مشکل تر ہو جاتا ہے۔ (اگرچہ ناروے، آئس لینڈ، ڈنمارک، سویڈن یا نیوزی لینڈ جیسے بعض ممالک جہاں یک ایوانی مقننہ ہے، وہ انفرادی یا شخصی حقوق کا سختی سے احترام کرتے ہیں؛ جبکہ روس اور زمبابوے جیسے دیگر ممالک میں جہاں دو ایوزنی مقننہ ہے وہاں شاید ان نظریات کا اتنا احترام نہیں کیا جاتا)۔

اگر ہر چیمبر کے اراکین کا انتخاب مختلف طریقوں سے کیا جائے تو یہ عوامی بحث میں وسیع تر نقطہ نظر کو سامنے لاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ تقریباً مساوی آبادی والے علاقوں سے نمائندوں کا انتخاب کرتا ہے۔ لیکن ہر ریاست اپنے سائز سے قطع نظر صرف دو سینیٹرز کا انتخاب کرتی ہے۔ اس سے اس بات کو یقینی بنانے میں مدد ملتی ہے کہ چھوٹی ریاستوں کے مفادات کو سنا جائے گا۔ آسٹریلوی سینیٹرز کا انتخاب واحد قابل منتقلی ووٹ کے نظام کے ذریعے کیا جاتا ہے جو ایوان نمائندگان میں استعمال ہونے والے 'انسٹنٹ رن آف' یا ترجیحی ووٹنگ کے نظام کے مقابلے میں اس چیمبر میں زیادہ تنوع کا باعث بنتا ہے۔

صدارتی نظام

جہاں قانون سازی کی طاقت کو ایگزیکٹو پاور سے الگ کیا جائے وہاں ایگزیکٹو/انتظامیہ کی قیادت اکثر صدر ہی کرتے ہیں۔ صدر کا کردار مختلف/متنوع ہو سکتا ہے۔ کچھ ممالک میں، جیسے کہ آئرلینڈ، یہ (صدر) بڑی حد تک رسمی ہوتے ہیں۔ دیگر ممالک میں، جیسے کہ امریکہ، صدر کے پاس مضبوط انتظامی اختیارات

ہوتے ہیں: دیگر چیزوں کے علاوہ، امریکی صدر کو وزراء اور عہدیداروں کو نامزد کرنے، بجٹ تجویز کرنے، قانون سازی کو ویٹو کرنے، معاہدوں پر گفت و شنید کرنے اور یہاں تک کہ جنگ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

صدور کا انتخاب مقبول بیلٹ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے یا انہیں قانون سازوں کے ذریعے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اگر وہ ایک وسیع پاپولر حق رائے دہی کے نتیجے میں منتخب ہو جاتے ہیں تو انہیں ایسی قانون سازی کے اقدامات کو روکنے کی آزادی اور قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جو بڑے پیمانے پر عوام کی آزادی اور سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ یہ طاقت و اختیار پر ایک اضافی مفید پابندی کہلا سکتی ہے۔

آئینی بادشاہتیں

لبرل جمہوریتوں کی ایک حیرت انگیز تعداد دراصل آئینی بادشاہتیں ہیں جس میں، جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے، بادشاہ کے اختیارات روایتی یا تحریری آئینی قوانین کے ذریعے محدود ہوتے ہیں۔ ان میں برطانیہ اور دولت مشترکہ کے ممالک جیسے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا شامل ہیں۔ یورپ میں بھی بعض ممالک جیسے بیلجیم، ڈنمارک، نیدرلینڈز اور اسپین میں محدود بادشاہتیں ہیں۔

ان بادشاہوں کی اصل طاقت یا اختیارات مختلف ہو سکتے ہیں تاہم یقینی طور پر ایک رسمی بادشاہ (جیسا کہ وہ زیادہ تر ہیں) کے پاس پر بھی کچھ اختیارات ضرور ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1981 میں سپین میں بغاوت کی کوشش کے دوران نئے بحال ہونے والے بادشاہ، جو آن کارلوس نے فوج کو کامیابی کے ساتھ بیرکوں میں واپس جانے کا حکم دیا تھا۔ آئینی بادشاہوں کی اہم اہمیت شاید وہ طاقت نہیں جو ان کے پاس ہوتی ہے، بلکہ وہ طاقت جو ان کے ہوتے ہوئے دوسرے لوگ، جیسے کہ فوجی افسران، ججز اور سیاستدان، حاصل نہیں کر سکتے۔

عوام کا کردار

بہت سے ناقدین 'ووٹر کی لاعلمی' کو جمہوریت کی ایک بنیادی خامی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن انتخاب کرنے والوں/ووٹرس کو خود ہر پالیسی کی تفصیلات پر غور کرنے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے: ان کا کام صرف ایسے نمائندوں کا انتخاب کرنا ہے جو ان کے لیے ایسا کریں گے۔ ایک پارٹی لیبل جو کہ امیدواروں کے مسائل پر وسیع موقف کا غماز ہے، اسے دکھ کر وہ تمام معلومات مل سکتی ہیں جو رائے دہندگان کو درکار ہوتی ہیں۔

رائے دہندگان کے نزدیک نمائندہ نظاموں کو 'شرکت پر مبنی' نظاموں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے جو فیصلہ سازی میں سب کو شریک کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انتخاب کرنے والے/ووٹرز اپنی پریشانیوں میں مصروف ہوں اور ان کے پاس سیاسی بحث میں حصہ لینے کیلئے وقت کم ہو یا انہیں دلچسپی ہی نہ ہو لہذا، یہ کام کسی ایسے شخص کے سپرد کرنا سمجھ میں آتا ہے جو ایسا نہ ہو، مطلب اس کی یہی پریشانی ہو، وقت بھی ہو اس کے پاس اور وہ دلچسپی بھی لیتا ہو۔ اور رائے دہندگان کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ جن قانون سازوں کا انتخاب کرتے ہیں وہ ان سے زیادہ ماہر اور بہتر سیاسی رائے/قوت فیصلہ رکھتے ہیں۔

پھر کیا چیز ہے جو سیاستدانوں کو فیصلہ سازی کی اس طاقت کا غلط استعمال کرنے سے روکتی ہے جو ووٹرز انہیں دیتے ہیں؟ انقلاب نہیں، بلکہ یہ انتخابی شکست کا خطرہ ہے۔ ایک بار پھر، جمہوریت میں عوام کا کلیدی کردار لیڈروں کا انتخاب کرنا نہیں بلکہ انہیں ہٹانے کی طاقت ہے۔

یہ سچ ہے کہ عوام مضبوط لیڈروں کو ترجیح دے سکتے ہیں، اور انہیں بڑے اختیارات سونپ سکتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی لیڈر زیادہ دیر تک مضبوط نہیں رہ سکتا اگر وہ عوام کی رضامندی سے محروم ہو جائے۔ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات سے قیادت میں تبدیلی پرامن طریقے سے آ سکتی ہے۔

اور آزادانہ تقریر، کھلی بحث اور ایماندارانہ انتخابات کے ساتھ، سیاست دانوں کو عوامی توثیق اور رضامندی کے لیے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اور دفتر میں واپس آنے کے لیے ایک اچھا مقدمہ پیش کرنا پڑتا ہے۔

پراسیس/عمل کا تحفظ/حفاظت

ووٹنگ کسی فرد کے لیے بہت اہم عمل نہیں ہے حالانکہ جمہوریت میں فیصلہ یہی کرتی ہے کہ کون حکومت بنائے گا یا نہیں بنائے گا۔ لیکن جب کوئی حکومت یا اقتدار میں آتا ہے تو ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ مفاد پرست گروہ اور سیاسی دھڑے انتخابی نتائج پر اثرانداز ہونے کیلئے دھوکہ دہی، رشوت، جبر، دھاندلیوں اور دیگر غیر قانونی ذرائع استعمال کر سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ عہدے پر فائز افراد حلقہ بندیوں میں ہیرا پھیری کی کوشش کر سکتے ہیں، ووٹروں پر اثرانداز ہونے کے لیے ریاستی وسائل، اور امیدواروں کو کمزور کرنے کے لیے ریاستی میڈیا کا استعمال کر سکتے ہیں۔ پولیس، فوج اور عدالتوں کو اپنے حریفوں کے خلاف بروئے کار سکتے ہیں، یا محض ہر امیدوار کو پڑنے والے ووٹوں کی تعداد کے بارے میں جھوٹ بول سکتے ہیں۔

ایک لبرل جمہوریت کو ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے آزاد حلقہ بندی اور الیکشن کمیشن، انتخابات کی بین الاقوامی جانچ پڑتال، امیدواروں کے ریاستی وسائل اور سرکاری میڈیا کے استعمال سے متعلق قوانین، اور انتخابی دھوکہ دہی کی سزا جیسے میکانزم/طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم، بہترین بند/رکاوٹ وہ کلچر ہے جو اس طرح کی بدعنوانی کو مسترد کرتا ہے۔

انتخابی نظام

بہت سے مختلف انتخابی نظام ہیں، اور مبصرین کے ہر ایک کے حوالے سے مضبوط آراء پائی جاتی ہیں کہ ان میں سے کون 'بہترین' نتائج پیدا کرتا ہے۔ لیکن 'بہترین' کیا ہے، یہ ایک قابل بحث موضوع ہے، یا یہ کہ اس حوالے سے ہر ایک کی اپنی اپنی رائے ہے۔ درحقیقت، ہر نظام میں خوبیاں اور کمزوریاں دونوں ہوتی ہیں۔

ایف پی ٹی پی (فرسٹ پاسٹ دی پوسٹ) ایک عام نظام ہے جس میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے

والا امیدوار منتخب ہوتا ہے۔ یہ سادہ، سمجھنے میں آسان، تیز اور واضح نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ انتخاب کرنے والوں کو رجوع کیلئے ایک واحد نمائندہ بھی فراہم کرتا ہے کہ اگر انہیں حکومت کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے یا وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف، اگر ڈالے گئے ووٹ بہت سے امیدواروں کے درمیان تقسیم ہو جائیں تو صرف اقلیتی حمایت کے ساتھ بھی کوئی منتخب ہو سکتا ہے۔ یہ نظام دو جماعتی سیاست کا حامی ہے، جو ضروری نہیں کہ پوری رائے عامہ پر محیط ہو۔ اور اگر انتخابی اضلاع چھوٹے ہیں تو نظام اکثر 'محفوظ' نشستیں پیدا کرتا ہے، جس سے ہارنے والے ووٹروں کو سرے سے کوئی حقیقی انتخابی اختیار یا طاقت ہی نہیں ملتی۔

ان مسائل کو کم کرنے کے لیے متناسب نمائندگی کے مختلف نظام وضع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک متبادل ووٹ کا طریقہ ہے۔ رائے دہندگان امیدواروں کی ترجیح کے لحاظ سے درجہ بندی کرتے ہیں، اور کم سے کم ووٹوں والے امیدوار ایک ایک فہرست سے خارج ہوتے جاتے ہیں، ان کی دوسری ترجیح جو ہوتا ہے یہ ووٹ اس کا شمار ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان میں سے کوئی ایک مجموعی اکثریت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ، کم از کم کسی حد تک، ہر ایک کی ترجیح شمار ہوتی ہے۔ لیکن پھر نظام کو سمجھنے اور انتظام کرنے میں پیچیدہ ہے۔ یہ تیسری پارٹی کے امیدواروں کی ایف پی ٹی پی سے زیادہ حمایت کرتا ہے، لیکن ایسا کرتے ہوئے یہ انتہا پسند جماعتوں کو قدم جمانے کا موقع فراہم کر سکتا ہے۔

اس کی ایک قسم 'کثیر رکنی حلقے' ہو سکتی ہے۔ یہ حلقے جتنے بڑے ہوں گے اتنا ہی ان کا ایک پارٹی کے لیے 'محفوظ' سیٹ بننے کا خطرہ کم ہو گا کیونکہ اس میں 'سنگل ٹرسفرایبل ووٹ سسٹم' (STV، واحد منتقلی ووٹ کا نظام) کے ذریعے امیدواروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جس میں ہارنے والے امیدواروں کو اس وقت تک فہرست سے خارج کیا جاتا ہے جب تک کہ ان کی اور سیٹوں تعداد ایک برابر نہیں ہو جاتی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس نظام کو سمجھنا اور چلانا اور بھی زیادہ پیچیدہ کام ہے۔ اس میں ووٹروں کو یہ بھی یقین یا معلوم نہیں ہو سکتا کہ ان کی نمائندگی کون کر رہا ہے۔ اور امیدوار ووٹروں کی طرف رجوع اور

اپیل کرنے کے بجائے پارٹی کی فہرست کا حصہ بننے میں زیادہ دلچسپی لے سکتے ہیں۔

بد قسمتی سے، اس طرح کے متناسب نظام اکثر 'سہولت کے اتحاد' (اکثر چھوٹی انتہا پسند جماعتوں پر مبنی) پر بنی حکومتیں تیار کرتے ہیں جو شاید عوامی رائے کی عکاس نہ ہوں اور انہیں ہٹانا بھی مشکل ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف، ایف پی ٹی پی و دیگر غیر متناسب نظاموں میں تیسرے فریق کی کم نمائندگی کا خطرہ ہوتا ہے۔

بہت سی دوسری قسمیں مشترک ہیں جیسے مخلوط ممبر سسٹم، جس میں اگر کوئی پارٹی قومی ووٹ کا بڑا حصہ حاصل کرتی ہے لیکن کچھ سیٹیں جیتتی ہے تو اسے امیدواروں کی پارٹی کی فہرست سے مختص اضافی سیٹیں دی جاتی ہیں۔ لیکن ایک بار پھر، اس سے ایسے امیدوار سامنے آتے ہیں جو ووٹروں سے اپیل کرنے کے بجائے پارٹی لسٹ میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔

صدارتی انتخابات کے لیے امریکہ الیکٹورل کالج سسٹم کو استعمال کرتا ہے۔ رائے دہندگان براہ راست صدر کے لیے ووٹ نہیں دیتے بلکہ مقامی امیدواروں کو ووٹ دیتے ہیں جو بدلے میں صدر کے انتخاب کے لیے ووٹ ڈالتے ہیں۔ یہ بہت بڑی ریاستوں میں ووٹروں کو، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ ملک کا ہر حصہ شمار میں آئے، چھوٹی ریاستوں کے ووٹروں پر غالب ہونے سے روکنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ صدر کا انتخاب پڑے گئے ووٹوں کی صرف ایک چھوٹی سی اقلیت پر بھی کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ڈونلڈ ٹرمپ 2016 میں اور جارج ڈبلیو بش 2000 میں منتخب ہوئے تھے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلاشبہ 'منصفانہ' ووٹنگ کا کوئی نظام نہیں ہے۔ لیکن اگر انتخابی نظام بحیثیت مجموعی کھلا، منصفانہ اور تبدیلی کا روادار ہو تو کم از کم ہارنے والے ہار مان لیں گے اور ہتھیار اٹھانے کے بجائے ایک اور موقع کا انتظار کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

عوام کے سامنے جوابدہی

لبرل جمہوریتیں، منفرد طور پر، بہت سے مختلف طریقوں سے عوام کے آگے جواب دہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر مقننہ انتظامی کارروائی میں تاخیر یا رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ عدالتیں اس بات کو یقینی بنا سکتی ہیں کہ فیصلے قانونی طور پر لیے جائیں اور ان پر عملدرآمد کیا جائے اور لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں۔ میڈیا اور آزاد ماہرین حکومتی پالیسیوں کی حکمت پر بحث کر سکتے ہیں۔ رائے دہندگان انتخابات میں حکومتوں کو سزا دے سکتے ہیں۔ امریکی طرز کی پرائمریز اور دیگر انتخابی اقدامات اس بات کو یقینی بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں کہ امیدوار دفتر کے لیے حقیقی طور پر موزوں ہیں۔ ریفرنڈم اور بیلٹ (رائے شماری) جیسے اقدامات سے اقتدار میں رہنے والوں پر مزید پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ وفاقیت، جس میں طاقت کا استعمال سب سے نچلی سطح پر کیا جاتا ہے (سب سے نچلی سطح فرد ہے)، لوگوں کو فاصلاتی (دور دراز) اور جابرانہ اختیار سے فرار ہونے کا موقع دیتا ہے۔ اور کئی طرح کے شہری گروپ قومی بحث میں مضبوط آواز رکھتے ہیں۔

آئین ایک اور مفید قدغن ہے اور یہ افراد کے بنیادی حقوق اور آزادیوں کی ایک قابل قدر ضمانت فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن آئین کی تشکیل کے عمل میں احتیاط کی ضرورت ہے: اس پر حکمران جماعتوں کا آسانی سے غلبہ ہو سکتا ہے یا ایسے نظریاتی اور مفاد پرست گروہ اسے ہائی جیک کر سکتے ہیں جو اپنے مفاد کے لئے سیاسی اداروں کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔

جمہوریت اور حقوق کے درمیان تناؤ

جمہوریت لامحالہ انفرادی حقوق اور اکثریت کی مرضی کے درمیان توازن ہے۔ لبرل جمہوریت حقوق کو ترجیح دیتی ہے۔ لیکن درست توازن کبھی بھی مستحکم نہیں ہو گا کیونکہ تفصیلات پر مکمل اتفاق کبھی نہیں ہو گا۔ لوگوں کو عوامی سطح پر کیا کرنے یا کہنے کا، یا اپنی زمین پر تعمیر کرنے، یا اپنا پیسہ (جیسے جوا، جسم

فروشی، منشیات یا شراب پر) خرچ کرنے کا حق ہے، یہ قابل بحث معاملات ہیں۔ حقوق غیر متنازعہ نہیں ہیں: یہ اخلاقی اصولوں کا سیاسی اظہار ہیں جن پر لوگ عدم اتفاق کرتے ہیں۔ لبرلز کا یہ کام ہے کہ اس بات کی ضمانت دیں کہ جہاں تک ممکن ہو، اکثریتی فیصلوں کی قیاس کردہ قانونی حیثیت کو اقلیت، اور آخر کار ہر فرد کی آزادیوں کو سلب کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

جمہوریت کے فوائد

طاقت کا ارتکاز/جمع ہونے سے روکنا

لبرل جمہوریت کا شاید سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ عوام کو تشدد کا سہارا لیے بغیر پرامن طریقے سے اپنے لیڈروں کو تبدیل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ مطلق العنان حکومتوں کے لیے، بغاوت اور انقلاب کا خطرہ ہمیشہ ایک بڑی تشویش کا باعث ہوتا ہے، اور وہ اسے روکنے کے لیے عام طور پر بڑی فوجیں رکھتی ہیں۔ لیکن ایسی فوجی طاقت کو عام طور پر تنقید کو دبانے اور طاقت کو مستحکم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس کے برعکس قیادت میں متواتر تبدیلی لیڈروں یا سیاسی دھڑوں کو طاقت جمع کرنے اور مضبوط بننے سے روکنے میں مددگار ہوتی ہے۔ اور یہاں تک کہ اگر کوئی حکومت غیر مقبول ہوجاتی ہے تب بھی یہ خدشہ کم ہوتا ہے کہ وہ جابرانہ قوتیں تشکیل دے کیونکہ جب انتخابات اکثر ہوتے ہیں تو پر تشدد انقلاب کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ امن کے ساتھ، انسانی کوششوں اور توجہ کو مزید نتیجہ خیز اور افزودہ سرگرمیوں کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔

تبدیلی جذب کرنے والی

لبرل جمہوریتیں موافقت اختیار کرنے والی ہوتی ہیں۔ وہ واقعات اور عوامی رویوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ وہ یہ کام دوسرے نظاموں سے بہتر

طریقے سے کر سکتی ہیں کیونکہ وہ کسی ایک سوچ یا نظریے کے پابند یا اس بارے تعصبات کا شکار نہیں ہوتیں کہ معاشرے کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ آئیڈیالوجی/نظریہ اور تعصب چیزوں کو کرنے کے ایک طے شدہ طریقے کو فروغ دیتے ہیں، اور اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی یا اس سے انحراف کی مزاحمت کرتے ہیں۔ جبکہ لبرل جمہوریت تبدیلی کو قبول کرتی ہے اور اس کو بہتری کیلئے استعمال میں لاتی ہے۔ مثال کے طور پر جمہوریت بہت سے مختلف نظریات اور طرز زندگی کو برداشت کرتی ہے۔ لہٰذا جب حالات بدلتے ہیں تو ہمارے پاس بہت سارے عملی آپشن ہوتے ہیں جو اپنے فائدے کے لیے تبدیلیوں پر قابو پانے، جذب کرنے، ہٹانے یا استعمال کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ امیگریشن، فلاح و بہبود کی فراہمی، فوجی مداخلت کی ضرورت یا ٹرانس جینڈر کے حقوق جیسے بہت سے اہم مسائل پر عوام کی رائے بدل سکتی ہے؛ جمہوری بحثیں اور فیصلے ان تحریکوں کے ساتھ ہی بدل جاتے ہیں۔ جمہوریت کسی بھی قسم کے معاشرے کے لیے ایک نظام ہے۔

لبرل جمہوریتوں کی رواداری، کھلے پن، تنوع اور سمجھوتہ کرنے کے جذبے کو دیکھتے ہوئے جب وہ جنگوں اور قدرتی آفات جیسے بڑے خطرات اور ہلچل کا سامنا کرتے ہیں تو وہ آمرانہ حکومتوں کے مقابلے میں بہت کمزور اور کم مرکوز (فوکسڈ) نظر آتی ہیں۔ لیکن یہی خوبیاں انہیں حیرت انگیز لچک اور طاقت بھی دیتی ہیں؛ ماضی کے فاشسٹ اور دیگر مطلق العنان لیڈر اس امر کے گواہ ہیں۔

ہماری مشترکہ اقدار کی بات

ایک اور فائدہ جو بہت سے مبصرین کو لبرل جمہوریت میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ افراد کی سیاسی مساوات جیسی اہم انسانی اقدار کو اپناتی ہے۔ اگرچہ وہ دوسرے طریقوں سے مختلف ہوں گے، جیسے کہ آمدنی یا دولت، تاہم ہر شہری انتخابی عمل میں حصہ لے سکتا ہے۔ وہ امتیازی سلوک یا جبر کے خوف کے بغیر ووٹر، پارٹی ممبر، امیدوار بننے یا مہم چلانے کے لیے آزاد ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ

وہ امیر ہیں یا غریب، ہنر مند ہیں یا غیر ہنر مند، شہری ہیں یا دیہاتی، اعلیٰ نسل کے ہیں یا ادنیٰ، یا ان کی نسل یا مذہب یا رنگ یا طبقہ یا خاندان یا سیاست کے بارے میں خیالات کچھ بھی ہیں، سیاسی طور پر ان کے خیالات برابر شمار ہوتے ہیں۔

دوسرے مبصرین اس حقیقت کی تعریف کرتے ہیں کہ جمہوریت معاشرے میں شرکت کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے یا کم از کم، یہ کسی کو بھی سیاست میں حصہ لینے سے اس لئے خارج نہیں کرتی کیونکہ حکومت میں موجود کچھ افراد انہیں نااہل، غیر مستحق، خلل انگیز یا غدار سمجھتے ہیں۔ نہ ہی جمہوریت میں آبادی کو ان لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جو حکمرانی کے لیے موزوں سمجھے جاتے ہیں اور جنہیں صرف محکومی کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہے، دوسری حکومتوں میں یہ تعصب خاصا عام ہے۔ لبرل جمہوریت کے تحت ہر کوئی ایک فعال شہری بننے اور کسی بھی عہدے کے لیے کھڑا ہونے کے لیے آزاد ہے، اور عوام کی وسیع جماعت فیصلہ کرتی ہے کہ اس کے لیے کون بہتر ہے۔

اس کے حامیوں کا کہنا ہے کہ سماجی معاملات میں وسیع پیمانے پر یہ شمولیت شہریوں کی فکری، اخلاقی اور سیاسی ترقی کو بھی فروغ دیتی ہے۔ یہ لوگوں کو سیاسی اور اخلاقی انتخاب (چوائسز) کے بارے میں سوچنے، اور کون سے پالیسی اقدامات ان کو بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں، ان پر بحث کرنے کا موقع اور ترغیب دیتی ہے۔

ایمانداری پر مبنی پالیسی کو فروغ دینا

لبرل جمہوریت کا مطلب ہے کہ ہم ان حکومتوں اور قوانین کے تحت رہتے ہیں جنہیں ہم، کم از کم کسی حد تک، خود منتخب کرتے ہیں نہ کہ ہم پر مسلط لیڈروں کی طاقت کے تحت۔ اس سے معاشرے میں طاقت کا استعمال اور لوگوں کو آمرانہ حکومتی فیصلوں کو قبول کرنے پر مجبور کرنے کی ضرورت کم ہو جاتی ہے۔ یہ سیاسی تبدیلی کا زیادہ متفقہ اور پرامن طریقہ ہے۔

منصفانہ اور آزادانہ انتخابات اور کھلی حکومت جو لبرل جمہوریت کا ایک حصہ ہیں، عہدے کے لیے کھڑے ہونے یا منتخب ہونے والوں کے درمیان احتساب اور شفافیت کو بھی فروغ دیتی ہے۔ چونکہ سیاست دان انتخابات میں عوام کی منظوری کے لیے مقابلہ کرتے ہیں، ان کا ریکارڈ، صلاحیتیں اور کردار سب جانچ پڑتال کے دائرے میں آتے ہیں۔ یا جیسا کہ امریکی ایچ۔ ایل۔ مینکن (1956) نے شرارت سے کہا تھا: "جمہوریت کے تحت ایک پارٹی ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش میں اپنی اہم توانائیاں صرف کرتی ہے کہ دوسری پارٹی حکمرانی کے لیے بالکل نااہل ہے، اور دونوں عام طور پر کامیاب اور درست ہوتی ہیں۔" لیکن پارٹیوں کے درمیان جھگڑے کے علاوہ، ووٹرز امیدواروں پر کڑی نظر رکھیں گے۔ دوسروں کی طرف سے ان کی خامیوں کی آسانی سے نشاندہی کی جائے گی۔ انہیں میڈیا اور سوشل میڈیا کی تحقیقات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور مفاد پرست گروہ اپنے پالیسی موقف پر ان سے نمٹیں گے۔

بے ایمانی کی سزا بھی ملتی ہے۔ اگر شہریوں کو معلوم ہو جائے کہ جن کو انہوں نے منتخب کیا ہے وہ بدعنوان، ناکافی ہیں یا غلط فیصلے کر چکے ہیں تو وہ انہیں ہٹانے کے لیے، یا تو اگلے انتخابات میں یا جیسا کے بعض ممالک میں ہوتا ہے واپسی/پلٹانے کی درخواست (''ری کال") کے ذریعے، ووٹ دے سکتے ہیں۔ اس کے برعکس مطلق العنان نظام میں برے لیڈروں کو آسانی سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔ اور جو لوگ اقتدار میں ہوتے ہیں وہ اکثر اس سے چمٹے رہتے ہیں، اور اپنی پالیسیوں سے بھی، چاہے انہیں اپنی ناکامی صاف کیوں نہ نظر آرہی ہو۔

تنقید اور ترقی

وہ رواداری جو لبرل جمہوریت کے کلیدی اصولوں میں سے ایک ہے ملک کی قیادت پر کھلی تنقید، ایسی چیز جو ہمیشہ دانشمندانہ ہوتی ہے نہ ہی بعض آمرانہ حکومتوں کے تحت ممکن، کی اجازت دیتی ہے۔ تنقید

سے محفوظ مطلق العنان لوگ اسکینڈلز کو دبا سکتے ہیں اور اس بات کو یقینی بنا سکتے ہیں کہ ان کی غلطیوں کو چھپایا جائے یا نظر انداز کیا جائے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ محض باتوں کی دکان ہے، لیکن ایسے کھلے فورم میں آزادانہ بات کرنے کی صلاحیت لیڈروں اور ان کے نظریات پر سوالیہ نشان اجاگر کرنے میں بہت اہم ہے۔ یہ عوامی بحث پھر ووٹرز کو آگاہ کرتی ہے اور پھر وہ اگلے انتخابات میں اپنے لیڈروں کا احتساب کرتے ہیں۔

یہ بھی انسانی ترقی کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے اگر نئی عوامی پالیسی کی تجاویز کو، اور درحقیقت کسی بھی موضوع پر کسی بھی طرح کے خیالات کو، کھلی بحث میں آزمایا جائے، جہاں لوگ ان (تجاویز یا موضوع) کی خوبیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کر سکیں۔ اس امر سے ممکنہ طور پر اچھے خیالات کو بہتر بنانے، اور کمزور خیالات کو قبل از نقصان ترمیم کر کے مضبوط بنانے یا پھر ترک کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے حامیوں کا کہنا ہے کہ 'ہجوم کی حکمت' کو بروئے کار لاتے ہوئے، جمہوریت ان نظاموں سے بہتر پالیسی فیصلے کر سکتی ہے جن میں حکام کے فیصلوں کو کھلی بحث میں چیلنج اور جانچا نہیں جا سکتا۔

انفرادی/شخصی حقوق کا تحفظ

بروس بو ئنو ڈی مسکیتا اور ان کے ساتھیوں (2003) کو معلوم ہوا کہ اعلیٰ معیار کے جمہوری ادارے رکھنے والے ممالک انسانی حقوق کے دفاع کے معاملے میں اچھا اسکور کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جمہوریت خود بخود یہ فوائد پیدا کر لے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ممالک جو حقوق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں یہ یقین رکھیں کہ جمہوریت ہی ان حقوق کا بہترین دفاع کرتی ہے۔ بہر صورت لبرل جمہوریتوں میں عام طور پر زندگی، آزادی، جائیداد کی ملکیت، آزاد وابستگی، آزاد تقریر، اور سیاسی عمل میں مساوی شرکت جیسے حقوق کو کی کڑی نگرانی/حفاظت کی جاتی ہے۔

اگرچہ جمہوری نظام اور حقوق کا احترام عام طور پر ایک ساتھ چلتے ہیں، لیکن اکثریت کی مرضی اور افراد

کے حقوق کے درمیان تناؤ برقرار رہتا ہے۔ اکثریت، اور ان کے منتخب کردہ سیاست دانوں کو بزعم خود 'ایسی اچھی وجوہات' نظر آئیں کہ جن کی بنا پر انہیں لوگوں کے حقوق پر قدغن لگانے کی سوجھے یا یہ فکر لاحق ہو۔ مثال کے طور پر وہ یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ عوام کو دہشت گردی کے خطرے سے بچانے کے لیے پولیس اور سیکورٹی حکام کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ افراد کو گرفتار اور طویل عرصے تک زیر حراست رکھیں، جب چاہیں گلیوں اور گھروں کی تلاشی لیں، اور بنیاد پرستی و انتہاپسندانہ سیاسی خیالات پر مبنی اشاعتوں کو روکیں۔ یا کسی وبائی مرض کو شکست دینے کے لیے وہ کاروبار بند کرنے اور لوگوں کو ان کے گھروں تک محدود رکھنے کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ بدقسمتی سے شہریوں کی جان، مال اور سلامتی کے جائز تحفظ اور جمہوری حکومت کے نام پر شہریوں پر ہونے والے ناجائز جبر کے درمیان کوئی واضح حد نہیں ہے۔ لہٰذا حقوق سلب کرنے کی ایسی تمام تجاویز کی جانچ پڑتال کی جانی چاہیے اور انتہائی احتیاط کے ساتھ ان کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔

امن اور خوشحالی

اکثر کہا جاتا ہے کہ جمہوریتیں ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتی ہیں۔ یہ بات مکمل طور پر درست نہیں ہے: بعض مواقعوں پر انہوں نے ایسا کیا ہے۔ اس کے باوجود بہت سی ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے جمہوری نظام آپس میں حکومت کی دوسری اقسام کے مقابلے میں زیادہ پرامن طریقے سے رہ سکتے ہیں۔ فوجی آمروں کے مقابلے میں عام طور پر انتخاب کرنے والوں/ووٹرز میں مسلح تصادم کا جوش کم ہوتا ہے۔ ان کا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوتا ہے، جبکہ ایک جمہوری حکومت ان کی جان، تحفظ اور املاک کو نظرانداز نہیں کرسکتی۔

بجا طور پر لبرل جمہوریتیں زیادہ خوشحال بھی ہوتی ہیں۔ اچھی حکومت اور خوشحالی کا پچھلی دو صدیوں سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ لیکن یہ اتنا واضح نہیں کہ جمہوریت زیادہ خوشحالی پیدا کرتی ہے۔ برطانیہ سمیت

بہت سے ممالک عالمگیر حق رائے دہی کا حق دینے یا اپنے انتخابات کو منصفانہ اور ایماندارانہ بنانے سے بہت پہلے امیر بن گئے تھے۔ لہٰذا، یہ جمہوریت نہیں ہو سکتی جس نے انہیں خوشحال بنایا۔ اگر خوشحالی کو فروغ دینے والا کوئی ایک عنصر ہے تو وہ جمہوریت نہیں بلکہ انفرادی حقوق کا احترام ہے کہ لوگ اپنی مرضی سے کام، پیداوار اور تجارت کریں۔ لیکن یہ ہے کہ جمہوریتیں ان حقوق کا زیادہ احترام کرتی ہیں۔

اگرچہ جمہوریت حیران کن طور پر مضبوط ہے لیکن اس میں آزادی اور خوشحالی کے اس لبرل انجن کو روکنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے کی اخلاقی قوت حکومتوں کو دولت پیدا کرنے والوں کا استحصال کرنے کا اعتماد دے سکتی ہے۔ اس سے محض کاروبار کے فوائد میں کمی آتی ہے اور ایجاد، سرمایہ کاری اور محنت کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے جبکہ سستی اور کھپت/خرچ کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ یہ شاید ہی خوشحالی کا کوئی نسخہ ہو۔

خلاصہ

لبرل جمہوریت کو کم از کم کچھ دوسرے نظاموں پر حقیقی فوقیت ضرور حاصل ہے خاص طور پر اس کی خود کو تبدیلی کے مطابق ڈھالنے اور لیڈروں اور پالیسیوں کو پرامن طریقے سے تبدیل کرنے کی صلاحیت اس کی ایک ایسی خوبی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ بہتر پالیسی سازی کو فروغ دے سکتی ہے، انفرادی حقوق کا تحفظ کر سکتی ہے، خوشحالی میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور امن کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سے قیاس شدہ فوائد اس سے کم واضح ہیں جتنا کہ ان کو فرض کیا جاتا ہے۔ اور ایسا نہیں کہ جمہوریت کے ناقدین نہیں ہیں۔

جمہوریت کی تنقید

جمہوریت کے فائدے ہو سکتے ہیں لیکن اس کی کچھ قیمتیں بھی ہیں۔ یہ بہت سے مسائل کو حل کرتی ہے مگر دوسرے پیدا کرتی ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ جمہوریت کو پٹڑی پر ڈالنا مشکل اور اتارنا آسان ہے۔ اس کی کارکردگی کا ریکارڈ بالکل درست نہیں ہے۔ پاپولسٹ پارٹیوں کا عروج اس بات کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ بہت سے رائے دہندگان یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت ان کی اچھی طرح سے خدمت نہیں کر رہی ہے۔ اس میں اقربا پروری (یارباشی)، بیوروکریسی کی من مانیوں، حکومت کی حد سے زیادہ مداخلت یا کنٹرول، استحصال، ووٹروں کی کوتاہ اندیشی (اور سیاست دانوں کی بھی جو صرف تھوڑی مدت کے لیے عہدے پر رہے ہوں) اور انفرادی حقوق کے خاتمے کا خطرہ ہے۔ کیا یہ واقعی اپنی توقعات، دعوؤں اور وعدوں پے پورا اترتی ہے، عملی یا چلو، اصولی طور پر بھی؟

الیکٹرز/ووٹرز کام کے نہیں (بیکار ہیں)

ایک اصولی مسئلہ یہ ہے کہ کیا ووٹر ایک قابل اعتماد بنیاد ہے جس پر کوئی ایسا نظام بنایا جا سکتا ہے جس پر اہم فیصلے لینے کے لیے بھروسہ کیا جا سکے۔ علامات اچھی نہیں ہیں: رائے دہندگان سیاسی معاملات سے نہایت بے خبر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے ایک ووٹ سے انتخابات کے نتائج کا تعین کرنے کا تقریباً کوئی امکان نہیں ہے۔ ایک کے مقابلے میں یہ لاکھوں ہو سکتے ہیں۔ لہذا، جب آپ کے ووٹ سے بہت کم یا کوئی فرق نہیں پڑتا تو پالیسی کے مسائل سے اپنے آپ کو مطلع کرنے کی زحمت کرنے کا فائدہ کیا ہے، کوئی نہیں (ایسا یہ بے خبر ووٹر سوچتے ہیں)۔

بنیادی وجہ کچھ بھی ہو، ووٹروں کی جہالت کی گہرائی چونکا دینے والی ہے۔ امریکی ماہر اقتصادیات برائن کیپلن (2007) "The Myth of the Rational Voter" میں لکھتے ہیں:

'تقریباً نصف امریکی یہ نہیں جانتے کہ ہر ریاست کے دو سینیٹرز ہوتے ہیں، اور تین چوتھائی کو ان کی مدت کا علم نہیں۔ تقریباً 70 فیصد یہ نہیں کہہ سکتے کہ کون سی پارٹی ایوان کو کنٹرول کرتی ہے اور 60 فیصد کو یہ نہیں معلوم کہ سینیٹ کو کون سی پارٹی کنٹرول کرتی ہے۔ آدھے سے زیادہ اپنے کانگریس مین/منتخب نمائندے کا نام نہیں لے سکتے، اور 40 فیصد اپنے کسی بھی سینیٹر کا نام نہیں لے سکتے۔ مزید برآں، یہ کم علمی سطح پولنگ کے بالکل آغاز کے بعد سے ہی مستحکم رہی ہے، اور بین الاقوامی تقابل سے پتہ چلتا ہے کہ امریکیوں کا مجموعی سیاسی علم اوسط سے بھی کم ہے۔'

اور نہ ہی وہ ہمیشہ اپنے ووٹ کا استعمال کرتے ہیں جیسا کہ جمہوریت کے نظریہ سازوں کا خیال ہے کہ اپنے پسندیدہ امیدوار کو منتخب کرنے کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ کسی دوسرے کو، محض اپنی حکومت کو عدم اطمینان کا پیغام بھیجنے کے لیے یا حتیٰ کہ اپنی گہری لیکن جاہلانہ، جانبدارانہ یا متعصبانہ رائے کو آواز دینے کے لیے، بعض اوقات بنیاد پرست امیدواروں کو ووٹ دے سکتے ہیں۔ (کہا جاتا ہے کہ جب بیسویں صدی کے امریکی سیاست دان اور سفارت کار ایڈلائی سٹیونسن دوئم کو ایک حامی نے کہا کہ وہ امریکہ میں ہر سوچنے والے شخص کا ووٹ حاصل کریں گے، تو انہوں نے جواب دیا، 'مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی؛ لیکن مجھے اکثریت کی ضرورت ہے!')۔

رائے دہندگان کے معقولیت کی بجائے جذباتیت سے ووٹ ڈالنے کا یہ رجحان امیدواروں کو ان تعصبات کو گلے لگانے کرنے پر اکساتا ہے۔ مقبولیت اور ووٹ کے حصول میں عہدے کے امیدوار (اور منتخب سیاست دان بھی) قابل غور اور عقلی دلائل کے بجائے نعروں اور آوازوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جمہوریت کے ناقدین کا کہنا ہے کہ ان سب سے ایسے انتخابی نتائج اور سرکاری پالیسی جنم لیتی ہے جو ثبوت اور دلیل کی بجائے تعصب اور جہالت پر مبنی ہوتی ہے۔

امیدوار اور منتخب سیاست دان بھی ایسے لابنگ کرنے والوں کے ذاتی مفادات کے آگے جھکتے ہیں جو ووٹروں کے ایک بڑے اور پرعزم گروہ کو جمع کرسکتے ہیں اور جن کی حمایت پر وہ انتخابات میں، میڈیا مہمات میں اور بعض اوقات مالی طور پر انحصار کرتے ہیں۔

لابنگ کے ممکنہ فوائد بہت بڑے ہوسکتے ہیں۔ (آپ) اپنے شعبے کے لیے ٹیکس میں رعایت حاصل کرنے میں، یا اپنے حریفوں کو باہر رکھنے کے لیے کوئی ضابطہ نافذ کرنے میں، یا کوئی بڑا سرکاری معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو یہ آپ کے کاروبار یا آپ کے مقصد کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتا ہے (مطلب بہت آگے لے جا سکتا ہے۔ درحقیقت ممکنہ فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ جمہوری حکومتوں کے مراکز میں جیسے کہ واشنگٹن، ڈی سی کے آس پاس کی شاہراہوں کے 'بیلٹ وے' کے اندر، یا وہ 'گاؤں' جو کہ لندن کا ویسٹ منسٹر علاقہ کہلاتا ہے، وہاں اسی وجہ سے لابنگ فرموں اور کارپوریٹ پبلک افیئرز کے دفاتر کی بھرمار ہے۔

لیکن لابنگ میں وقت، محنت اور پیسہ بہت لگتا ہے۔ (واشنگٹن کا ایک تھنک ٹینک کا صرف مالیاتی لاگت تقریباً 3.5 بلین ڈالر سالانہ ہے)۔ اس لیے جو لوگ لابنگ میں مشغول ہوتے ہیں وہ عام طور پر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں عوامی پالیسی کو تبدیل کرنے میں کچھ مضبوط گروہوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے یا وہ اس میں ذاتی دلچسپی رکھتے ہیں، یا جو حکام کی طرف سے خصوصی بھلائی اور سلوک کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ان کے مفادات وسیع تر عوام سے بہت مختلف ہوسکتے ہیں (اور اکثر ہوتے بھی ہیں)۔ یہ سب (عوامل) لابنگ کو ان پالیسی فیصلوں پر اثرانداز ہونے کا ایک بہت مہنگا، متعصب، غیر نمائندہ اور غیر معقول طریقہ بناتے ہیں جن کی پابندی پوری آبادی کو کرنا ہو گی۔ لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ جمہوریت کی سرشت میں ہے یا یہ کہ یہ ساری خامیاں موروثی ہیں، جمہوریت چاہیے تو ورثہ میں یہ ملیں گی۔

'کسی بھی نئے قانون یا ضابطے کی تجویز کو ہمیشہ بڑی احتیاط کے ساتھ سنا جانا چاہیے، اور اسے کبھی بھی اس وقت تک نہیں اپنایا جانا چاہیے جب تک کہ اسے طویل اور احتیاط سے جانچنے کے بعد نہ صرف انتہائی

محتاط بلکہ انتہائی مشکوک توجہ کے ساتھ نہ جانچا جائے۔ یہ (تجویز) ایسے لوگوں کی طرف سے آتی ہے جن کا مفاد عوامی مفاد کے ساتھ کبھی بھی مطابقت نہیں رکھتا، جو عام طور پر عوام کو دھوکہ دینے اور یہاں تک کہ ان پر ظلم کرنے (انہیں دبانے) میں دلچسپی رکھتے ہیں، اور جنہوں نے کئی مواقع پر انہیں دھوکہ دیا اور ان پر ظلم کیا ہے۔ 'ایڈم سمتھ (1776)، 'دی ویلتھ آف نیشنز'، پہلی جلد، گیارہواں باب

یہ غیر موثر فیصلے کرتی ہے۔۔۔

جمہوریت کو بڑے پیمانے پر مشکل، متنازعہ یا فوری فیصلے لینے کے حوالے سے برا سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ عوام اور سیاست دانوں دونوں کے درمیان بہت سے مختلف خیالات کارفرما ہوتے ہیں اس لیے اتفاق رائے تک پہنچنا مشکل اور دستیاب آپشنز پر تیزی سے کارروائی کرنا ناممکن ہوسکتا ہے۔ قومی ہنگامی صورتحال، جو فوری ردعمل کا تقاضہ کرتی ہے، طویل پارلیمانی بات چیت کیلئے بہترین وقت نہیں ہوتا ہے۔ اور جب اختیارات مختلف قانون ساز ایوانوں کے درمیان یا مقننہ، ایگزیکٹو اور عدلیہ کے درمیان تقسیم ہوں تو کسی بھی پالیسی پر اتفاق رائے میں اور بھی زیادہ دیر لگ سکتی ہے۔

مزید برآں، جب معاملات انتہائی متنازعہ ہوں، خواہ وہ فوری نہ بھی ہوں، تب بھی جن آراء میں موافقت کی ضرورت ہے وہ طویل اور پیچیدہ پارلیمانی اور عوامی بحثوں کا باعث بن سکتی ہیں۔ جیسا کہ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی (1957) نے برے جامع اور مختصر انداز میں کہا: 'جمہوریت کا مطلب ہے بحث کے ذریعے حکومت، لیکن یہ تبھی موثر ہے جب آپ لوگوں کو بات کرنے سے روک سکتے ہوں۔' اور جب رائے یکساں طور پر تقسیم ہو، یا جب بہت سے مختلف ممکنہ آپشن دستیاب ہوں تو یہ عمل تعطل (ڈیڈ لاک) بھی پیدا کرسکتا ہے۔ اکثر ایسے معاملات کو پھر شواہد اور دلیل کی بجائے مختلف گروہوں کو ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے انہیں مختلف، اکثر غیر متعلقہ، مراعات دے کر صرف 'ہارس ٹریڈنگ' کے ذریعے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔

۔۔۔اور برے فیصلے

دیگر ایسی کئی وجوہات ہیں کہ بھلا کیوں جمہوری طور پر منتخب نمائندہ حکومتیں غلط فیصلے کر سکتی ہیں۔ ریاستی طاقت اکثریت کے لیے دوسروں کا استحصال کرنا، خاص طور پر ان پر ٹیکس لگانے یا ان کی جائیداد ضبط کرنے کے معاملے میں، آسان بناتی ہے۔ اور جب اکثریتی فیصلوں کو ریاست کی طاقت اور 'جمہوری' ہونے کے قانونی جواز کی حمایت حاصل ہو تو اس استحصال کی حد کی واضح حد نہیں ہوتی۔ بد ترین طور پر یہ قانونی طور پر چوری ہے۔ بہترین طور پر زیادہ ٹیکسوں اور ضبطی کا خطرہ لوگوں کو محنت کرنے اور پیداواری سرمایہ اور دولت کی پیداوار سے روکتا ہے۔ ناقدین کے خیال میں یہ بے نتیجہ بھی ہے: جو لوگ اپنی کمائی خرچ کرتے ہیں شاید وہ سیاست دانوں کے مقابلے میں، جو ٹیکس دہندگان کی جیبوں سے نکالا گیا پیسہ خرچ کرتے ہیں، زیادہ احتیاط اور کفایت شعاری سے خرچ کرتے ہوں۔

اس سے بھی بد تر بات یہ ہے کہ ووٹروں کے تعصبات کو بروئے کار لاتے ہوئے سیاست دان اکثر ایسے فیصلے کرتے ہیں جو واضح طور پر نقصان دہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر تقریباً تمام ماہرین اقتصادیات آزاد تجارت کی خوبیوں پر متفق ہیں؛ لیکن سیاست دان غیر ملکی مسابقت کے بارے میں مال بنانے والوں اور عوام کے خدشات کے پیش نظر عام طور پر اس کی جگہ درآمدی کوٹے اور ٹیرف جیسی تحفظ پسند پالیسیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک 'غیر ملکی ہماری ملازمتیں لے رہے ہیں' شکایت کرنے والے ووٹروں کے فوری خطرے کی اہمیت اس بعد کی اور وسیع خوشحالی سے کہیں زیادہ ہے جس کا وعدہ آزاد تجارت کرتی ہے۔

اس کی توجہ قلیل مدتی ہے

غلط فیصلہ سازی کی حوصلہ افزائی اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ منتخب لیڈروں کا کریئر مختصر ہوتا ہے۔ وہ مقبول پالیسیوں کی قلیل المدتی تعریف سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن وہ شاذ و نادر ہی اتنی دیر تک

عہدے پر رہتے ہیں کہ ان پالیسیوں سے ہونے والے کسی بھی طویل المدتی نقصان کیلئے انہیں جوابدہ ٹھہرایا جائے۔ اس لیے ان کے لیے یہ بات سیاسی طور پر قبل فہم ہے کہ وہ اپنے اخراجات کو بڑھانے کے لیے مزید رقم ادھار لیں یا نوٹ چھاپیں، جبکہ اس کے نیتیجے میں جو سرکاری قرضے بڑھیں گے یا افراط زر میں جو اضافہ ہو گا،وہ وہ جانیں اور ان کے جانشین۔

ناقدین کا کہنا ہے کہ حکومت کا ایک زیادہ معقول نظام ایسی پالیسیاں تیار کرے گا جن کا مقصد اپنی شہرت کیلئے سیاست دانوں کی قلیل المدتی خواہش سے چلنے والی پالیسیوں کی بجائے اپنے شہریوں کے لیے طویل المدتی خوشحالی ہو گا۔ ایک معقول نظام پیداواری لوگوں پر محض اکثریت کی حسد یا اکثریت کی دوسروں کی قیمت پر مفت مراعات کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ٹیکس لگانے اور ان کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ لیکن سخت حدود کے نفاذ کے بغیر 'جمہوری' نظام بالکل ایسا ہی کرتے ہیں۔ مستقبل کے لیے سرمایہ کاری بڑھانے میں مدد کرنے کے بجائے وہ چوری کرتے ہیں اور آج کی کھپت کے لیے سرمایہ خرچ کرتے ہیں۔ لامحالہ اس سے پورے معاشرے کی طویل المدتی خوشحالی کو نقصان پہنچتا ہے۔

اور چونکہ تقریباً ہر کوئی ووٹر کی حیثیت سے اس عمل میں شامل ہوتا ہے اس لیے انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ 'ان کی' حکومت ہے اور اس کے فیصلے 'ان کے' فیصلے ہیں۔ اس طرح کی زبان بتاتی ہے کہ اکثریت کی طرف سے اقلیتی گروہوں کے خلاف غنڈہ گردی یا لوٹ مار نارمل، جائز، اور مید غیر اخلاقی نہیں ہے۔۔۔ جیسا کہ اگر کوئی دوسرا گروہ ایسا کرتا تو بھی جائز اور نظر انداز کیا جاتا۔

یہ ریاستی طاقت پر انحصار کرتی ہے

منتخب حکومت کے فیصلے خواہ جتنے بھی برے ہوں، آپ ان سے بچ نہیں سکتے۔ زیادہ تر فیصلے جرمانوں، قید، لائسنسوں اور تجارتی اجازت ناموں کی منسوخی اور بہت سی دوسری پابندیوں کے ذریعے ان لوگوں

پر بھی عائد کیے جاتے ہیں جو ان سے متفق نہیں ہوتے۔ نہ ہی کوئی بچاؤ کا راستہ ہے: عام شہریوں کو کسی کے خلاف طاقت استعمال کرنے کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے بشمول ایک ایسی حکومت کے جو ان کا استحصال کرتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ جمہوری فیصلہ سازی سے 'فری رائڈر/مفت سوار' کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ہر کوئی عوامی خدمات جیسے کہ دفاع اور پولیسنگ سے مستفید ہوتا ہے اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کیلئے اس لاگت میں حصہ ڈالنا ضروری ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ مصیبت یہ ہے کہ ایک بار جب ہم اس اصول کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ریاست عوام کا پیسہ لے سکتی ہے تو پھر اس سلسلے کا کوئی منطقی انجام نہیں ہے، مطلب یہ سلسلہ رکے گا نہیں۔

اسی طرح یہ بھی معقول سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک حکومت کو ہنگامی حالات میں انفرادی اور شہری حقوق کو سلب کرنے کے قابل ہونا چاہیئے۔ مثال کے طور پر دہشت گردی کی منصوبہ بندی کرنے والے لوگوں کی جاسوسی کی یا انہیں حراست میں لیا جا سکتا۔ لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ جب ریاست کو ایک مرتبہ 'ہنگامی' اختیارات دے دیے جاتے ہیں تو پھر ان کے استعمال کی کوئی واضح حد نہیں ہوتی۔ اور جیسا کہ ایف۔اے ہائیک (1979) نے نشاندہی کی: 'ہنگامی حالات ہمیشہ سے ایک ایسا بہانہ رہا ہے جس کی بنیاد پر انفرادی آزادی کے تحفظات کو ختم کیا گیا ہے۔'

مثال کے طور پر 8-2007 کے مالیاتی بحران کی وجہ سے مغربی حکومتوں نے بینکوں پر قبضہ کر لیا اور دوسرے مالیاتی کاروباروں پر بھی سخت ضابطے نافذ کر دیے۔ صرف ایک دہائی کے بعد، کورونا کے وبائی مرض کے دوران، یہاں تک کہ لبرل جمہوریتوں کے سب سے زیادہ لبرل حکومتوں نے بھی لوگوں کی نقل و حرکت پر حیران کن پابندیاں عائد کیں (بشمول انہیں گھر تک محدود رکھنے کے)، اور ساتھ ہی کاروبار بند کرائے (جیسے جم، کھیلوں کی تقریبات، ہیئر ڈریسرز اور ریستوراں) 'غیر ضروری' اشیا کی فروخت پر پابندی لگائی، اور بڑے پیمانے پر ریاستی شعبے کو پھیلایا۔ 2020 کے اوائل میں بہت سے

لوگ وائرس پر قابو پانے کے مفاد میں رضاکارانہ طور پر ایسی پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ لیکن جیسے جیسے سال گزرتا گیا اور پابندیاں جاری رہیں (یا اس سے بھی گہری/سخت ہوتی گئیں) تو ان کے خلاف عوامی ناراضگی بڑھتی گئی۔ اس کے بعد سیاست دانوں نے خود ریاستی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ایسے ناپسندیدہ شہریوں کی ایک قابل ذکر تعداد پر پابندیاں عائد کیں جو یہ شکایت کر رہے تھے کہ وہ اب ایک 'پولیس سٹیٹ' میں رہ رہے ہیں۔

ناقدین کا کہنا ہے کہ اگر دنیا کی سب سے زیادہ لبرل جمہوریتوں میں انفرادی حقوق کو اتنی آسانی سے معطل کیا جا سکتا ہے تو ہمیں ان اختیارات سے ہوشیار رہنے کا حق ہے جو کہ انتخابی اکثریت ہمارے سیاسی رہنماؤں کو عطا کرتی ہے۔ جو بھی اختیارات ہم انہیں دیتے ہیں وہ جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر ہمارے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ سیاستدان حقوق کے مضبوط تحفظ کی طویل المدتی اہمیت کو شاید نہ سمجھ سکیں، اور نہ ہی یہ سمجھیں کہ وہ ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اور اگر انہیں احساس ہو بھی جائے تب بھی انہیں پرکشش قلیل المدتی مراعات کا سامنا ہوتا ہے کہ اپنے اختیار کو زیادہ سے زیادہ وسیع کر سکیں۔

ان سب کے باوجود، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، جمہوریتیں غیر معمولی طور پر مستحکم ثابت ہوئی ہیں۔ وہ تاریخی ادوار جہاں حکومت میں لبرل اقدار کا غلبہ رہا ہے بجا طور پر وہ ہیں جب تہذیب نے بہت تیزی سے ترقی کی نہ صرف معاشی طور پر بلکہ سائنس، ٹیکنالوجی، آرٹ، تعلیم، ادب اور بہت کچھ کے حوالے سے۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے اس طرح کی ترقی کو قربان نہیں کرے گا۔ مگر اصل پریشانی یہ ہے کہ ہم اسے غلطی سے ختم کر دیتے ہیں۔

یہ زیادہ بڑی حکومت کو فروغ دیتی ہے

جمہوریت کے حامیوں کا ماننا ہے کہ یہ سیاسی طور پر غیر جانبدار ہوتی ہے۔۔ جو آبادی چھوٹی حکومت کے حق میں ہو اور جو زیادہ سماجی اور اقتصادی مداخلت کی حامی، دونوں کے لیے یکساں طور پر اچھی طرح سے

کام کرتی ہے۔ لیکن ایک بار پھر جمہوریت کو خاص طور پر اجتماعی فیصلہ سازی کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔۔۔ ایک ایسا نکتہ جو پولش تھیورسٹ روزا لکسمبرگ (1899) جیسے مارکسسٹوں کے لئے بہت اہم ہے جب انہوں نے صاف صاف لکھا: 'جمہوریت سوشلزم کے لیے ناگزیر ہے۔'

اگرچہ لبرلز حکومت کے دائرہ کار پر حدود طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ طے کرنے کا کوئی معروضی طریقہ باقی نہیں بچا ہے کہ کون سے فیصلے اجتماعی طور پر کیے جائیں، اور کون سے افراد پر چھوڑے جائیں۔ اور عملاً جمہوریت سیاسی طور پر بالکل غیر جانبدار نظر نہیں آتی ہے۔ 1900 کی دہائی کے اوائل میں، جمہوری حکومتوں نے شاذونادر ہی قومی آمدنی کا 10 فیصد سے زیادہ حصہ لیا۔ 2000 کی دہائی کے اوائل تک، 40-50 فیصد کافی حد تک معمول بن چکے تھے۔ یہ امر ان فیصلوں کی عکاسی کرتا ہے جو اب انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر کیے جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے دوران اجتماعی فراہمی نے فلاح و بہبود سے لے کر صحت کی دیکھ بھال تک، رہائش، تعلیم، انشورنس، ٹرانسپورٹ، یوٹیلیٹیز، مینوفیکچرنگ اور بہت کچھ سمیت زندگی کے وسیع شعبوں کا احاطہ کیا۔ غالباً اس طرح کی توسیع کو فرنچائز، خاص طور پر حق رائے دہی کی خواتین تک توسیع کی بدولت جائز قرار دیا گیا تھا۔ اور جبکہ دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں حکومتی بجٹ میں اضافہ ہوا تو زیادہ سے زیادہ مفاد پرست گروہوں نے ریاست سے زیادہ سے زیادہ فوائد و مراعات مانگیں جو سیاست دانوں نے ووٹوں کی خاطر انہیں عطا کر دیں۔

وہی قوتیں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ سیاست دانوں کے ووٹ کا مقصد، اور اکثریتی ووٹنگ کی فرض کی جانے والی حکمت اور قانونی حیثیت 'لبرل'، 'قدامت پسند' یا 'فری مارکیٹ' کی حامی پارٹیوں تک کو اجتماعی فیصلہ سازی کو زیادہ سے زیادہ گہرائی سے معاشی، سماجی شعبوں اور شخصی زندگی تک وسعت دینے پر اکساتی ہے۔ سیاست دان بھی بڑے، متاثر کن لیکن اکثر مہنگے اور فضول سرکاری منصوبوں کو، بجائے مناسب مالیاتی نظام پر زور دینے کے الٹر ادھر کی رقم سے، فروغ دے کر توجہ اور ووٹ حاصل

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ امریکی مصنف گور وِڈل نے آر میجگیڑون (1987) میں لکھا تھا: 'ہماری جمہوریت کی شکل رشوت خوری ہے، اعلیٰ پیمانے پر۔' اور یہ سب زیادہ تر لوگوں کی خواہش کے برعکس اس سے بھی بڑی حکومت پیدا کر سکتے ہیں۔

اس کے نادیدہ اخراجات ہیں

اگرچہ جمہوری نظاموں کے فوائد کو آسانی سے سراہا جاتا ہے لیکن ان کے مالی، سماجی اور اخلاقی قیمتوں کو اکثر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ سماجی ہم آہنگی کی حوصلہ افزائی سے پرے، جمہوریت درحقیقت برے رویے کو فروغ دیتی ہے جس میں سیاسی جماعتیں توجہ اور بالادستی کے لیے گروہوں کی طرح لڑتی ہیں، سیاست دان قوم کی طویل المدتی صحت کی بجائے اگلے انتخابات پر اپنی توجہ مرکوز کئے ہوتے ہیں، جبکہ لابنگ کرنے والے گروہ دوسرے لوگوں کے خرچے پر خصوصی سلوک حاصل کرنے کے لیے نظام کو گھٹیا انداز میں استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔

لہٰذا، ناقدین مزید کہتے ہیں کہ، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جمہوریت نے ہمیں پچھلی صدی میں بڑی، مہنگی اور زیادہ مرکزی حکومت دی ہے۔ سیاست دانوں، کاروباری اداروں اور دیگر مفاد پرست گروہوں کو ریاستی شعبے کو وسعت دینے اور اس سے زیادہ طاقت یا فوائد حاصل کرنے میں دلچسپی ہے۔ جب مختلف گروہ اپنے آپ کو زیادہ فوائد/مراعات دیتے ہیں اور اخراجات، بشمول آنے والی نسلوں کے جن کے پاس مزاحمت کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، دوسروں کے سر ڈالتے ہیں تو ٹیکس اور قرض ہمیشہ اوپر کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

جمہوریت ایک ایسی جگہ ہے جہاں بے شمار انتخابات ہوتے ہیں، بہت بڑی قیمت پر، بغیر مسائل کے، اور قابل تبادلہ امیدواروں کے ساتھ۔ -گور وِڈل (1991)، 'آ ویو فرام دی ڈائنرز کلب'

ان قوتوں کو ختم کرنا یا ان پر کنٹرول کرنے والے سیاسی طبقے کو بے دخل کرنا آسان نہیں ہے۔ جیسا کہ

ماہرین اقتصادیات کہتے ہیں: سیاست میں داخلے کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں، نئی اور چھوٹی جماعتوں کے لیے حکومت میں شامل ہونا، خاص طور پر 'فرسٹ پاسٹ دی پوسٹ' ووٹنگ سسٹم میں مشکل ہوتا ہے۔ لہذا مروجہ کرونی ازم (اقربا/یار پروری) کو شاذ و نادر ہی اہم چیلنج درپیش ہوتا ہے۔ لیکن پاپولسٹ تحریکوں کا عروج اس بات کا اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ بدل رہا ہے۔

جمہوریت کا حد سے زیادہ راگ الاپنا؟

'جمہوریت' نے بطور امن، خوشحالی، انصاف اور آزادی لانے والی کے تقریباً اساطیری حیثیت حاصل کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائدین اس لفظ کو اپنی حکومتوں پر لاگو کرنے کے بہت زیادہ خواہش مند نظر آتے ہیں چاہے وہ حقیقت میں مطلق العنان ہی کیوں نا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لبرل جمہوریتوں میں رہنے والے لوگ اکثر جمہوریت کی صلاحیتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ ہمیں ان مبالغہ آرائیوں پر نظر ڈالنے اور یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کتنی حد تک ان میں حقیقت ہے۔

جمہوریت بہترین نظام ہے

یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ جمہوریت بہترین سیاسی نظام ہے یا کسی بھی قیمت پر، کم سے کم برا۔ بدقسمتی سے یہ یقینی طور پر جاننے کے لیے ہمیں دیگر تمام تصوراتی نظاموں کو آزمانے کی ضرورت ہو گی۔ اور آخر پھر بھی، ہمیں سیاسی نظام کو کن معیاروں سے پرکھنا چاہیے؟ مثال کے طور پر عوامی معاملات میں شہریوں کو شامل کرنے میں جمہوریت اچھی ہے، لیکن بحرانوں کے دوران یہ سست اور غیر فیصلہ کن ہو سکتی ہے۔ یہ بدعنوان ہو سکتی ہے لیکن یہ انسانی فلاح، خوشحالی اور آزادی کو فروغ دینے کے معاملے میں سب سے بہتر لگتی ہے۔ درحقیقت، امریکی ماہرین اقتصادیات رابرٹ لاسن، ریان مرفی اور بینجمن پاول کے (2020) ایک سروے سے پتا چلا ہے کہ جمہوریت معاشی آزادی سے مضبوطی سے جڑی ہوئی ہے۔ لیکن کیا اسے مجموعی طور پر 'بہترین' نظام کے طور پر پرکھنا چاہئے یہ ذاتی رائے کا سوال ہے۔

'کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جمہوریت کامل ہے یا سب کچھ جانتی ہے۔ درحقیقت یہ کہا گیا ہے کہ

جمہوریت بد ترین طرزِ حکومت ہے سوائے ان تمام دوسری صورتوں کے جنہیں وقتاً فوقتاً آزمایا جاتا رہا ہے۔ سر ونسٹن چرچل (1947)، ہینسارڈ، 11 نومبر

یہ عوام کی حکمرانی ہے

جمہوریت کو اکثر 'عوام کی حکمرانی' کہا جاتا ہے۔ ایسا کہنا غلط ہے۔ جدید جمہوریتوں میں عوام حکومت نہیں کرتے۔ وہ اپنے حکمرانوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ قوانین کا فیصلہ نہیں کرتے۔ ان کے نمائندے ان کی جگہ یہ فیصلہ کرتے ہیں۔

مزید بر آں 'عوام' کوئی ایک فیصلہ ساز نہیں ہے، بلکہ لاکھوں افراد ہیں جن کے عوامی معاملات پر مختلف - اور اکثر متحارب خیالات ہوتے ہیں۔ وہ اس بات پر متفق نہیں کہ سرکاری پالیسی کے مقاصد کیا ہونے چاہئیں، ساتھ ہی اس بات پر بھی کہ ان مقاصد کو کیسے حاصل کیا جائے۔ وہ 'حکمرانی' کرنے کے طریقے پر متفق نہیں ہو سکتے اور نہ ہوتے ہیں۔ جمہوریت کچھ عمدہ اور پائیدار اتفاق رائے پیدا نہیں کرتی: جو بھی گروپ دوسروں سے زیادہ ووٹ حاصل کر سکتا ہے اس کی رائے غالب ہوتی ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ عمل 'لوگوں کی حکمرانی' نہیں ہے بلکہ گینگ وار کی طرح ہے۔

یہ رضامندی کے زریعے حکومت ہے

جمہوریت کو 'رضامندی کے زریعے حکومت' کہا جاتا ہے۔ کسی حد تک یہ سچ بھی ہے۔ لیکن ناقدین کا کہنا ہے کہ جمہوریت کی حقیقت یہ ہے کہ قانون سازی کے فیصلے سیاسی اشرافیہ کرتی ہے۔ عوام کی طرف سے صرف 'رضامندی' ان اکثر افراد کی طرف سے دی گئی معمولی رضامندی ہے جو عام طور پر کئی سالوں کے وقفے سے ہونے والے انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی زحمت کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ اگر دوسرے لوگ آپ کے لیے فیصلے کرتے ہیں تو آپ کو 'رضامندی' کے لیے نہیں کہا جا

سکتا۔ لیکن جمہوریت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اکثریت پالیسی کا فیصلہ کرتی ہے اور باقی سب کو اسے قبول کرنا پڑتا ہے یا پھر جرمانے یا قید جیسی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ ان کے خلاف ووٹ دیتے ہیں تب بھی اکثریت آپ کی زندگی پر حاوی رہتی ہے اور کسی آمر کی طرح آپ کے پرس پر چھاپہ مارتی ہے۔

نہ ہی رائے دہندگان کی قیاس کردہ 'رضامندی' بھی معقول اور آگہی پر مبنی ہے۔ نہ صرف وہ تفصیلی مسائل سے ناواقف ہیں بلکہ کوئی بھی ووٹر مستقبل کی پیشین گوئی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا وہ قطعی طور پر یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ امیدوار کیسے کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے، اور نہ ہی ان کی پالیسیوں کے وسیع اثرات (اچھے یا برے) کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کے ووٹوں کی سرے سے کوئی معقول بنیاد ہی نہیں ہے۔

برائن کیپلن (2007) کا کہنا ہے کہ حالات اور بھی خراب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ووٹر منظم طور پر متعصب اور غیر معقول ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ چیزیں خراب ہوتی جارہی ہیں جبکہ وہ نہیں ہوتیں (خراب)؛ وہ سمجھتے ہیں کہ ملازمتیں پیدا کرنا قدر/معیار پیدا کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ وہ غیر ملکیوں کے حوالے سے متعصب اور ملکی صنعتوں کے تحفظ کے حق میں ہوتے ہیں۔ اور وہ حالیہ لیکن غیر متعلقہ واقعات، جیسے ان کے ملک کی اولمپک کارکردگی، سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ تمام تعصبات ایسے پالیسی فیصلوں کا باعث بنتے ہیں جو منظم طور پر غیر معقول، مسخ شدہ اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔

ہر ایک کی سنی جاتی ہے

جمہوریت بارے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ سرکاری پالیسی پر 'سب کو مساوی رائے دیتی ہے۔' لیکن 'ہر ایک' کو ووٹ دینے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ تاریخ کے بیشتر حصوں میں یہاں تک کہ سب سے زیادہ آزاد خیال قوموں نے بھی خواتین کو ووٹ دینے سے انکار کیا، ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی جن کی جائیداد

نہیں تھی اوریا جو نسلی اقلیتیں تھیں۔ اور وہ رائے دہندگان، اکثر آبادی کا نصف یا اس سے زیادہ، جو ووٹ نہ ڈالنے کا انتخاب کرتے ہیں ان کی نتیجے میں کوئی رائے نہیں ہوتی۔ لیکن پھر اگر آپ ووٹ دیتے بھی ہیں تو آپ کے ووٹ کا چانس در حقیقت کسی بڑے ملک میں انتخابات کے نتائج کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک بمقابلہ دسیوں (یہاں تک کہ سینکڑوں) لاکھوں کا ہے۔

جمہوریت وہ نظریہ ہے کہ عام لوگ جانتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور تمام تر چیلنجز و مشکلات کے باوجود اسے حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔ -ایچ ایل مینکن (1915)، 'آفیو پیجز آف نوٹس'

اور نہ ہی لوگوں کے ووٹوں کو برابر شمار کیا جاتا ہے۔ ایک 'محفوظ' انتخابی ضلع، جہاں ایک ہی پارٹی ہمیشہ جیتتی ہے۔ میں رہنے والے لوگوں کے ووٹ ایک 'معمولی' علاقے کے لوگوں کے ووٹوں سے قدر اور اثر کے لحاظ سے کم ہوتے ہیں یعنی محفوظ ضلع کے ووٹوں کا اتنا وزن نہیں ہوتا۔ اور عملی آبادیاتی وجوہات کی بناء پر ووٹنگ کے کچھ اضلاع میں دیگر اضلاع سے کہیں زیادہ ووٹرز ہو سکتے ہیں۔ لہذا، اگر ہر ضلع صرف ایک نمائندہ منتخب کرتا ہے تو چھوٹے علاقوں میں رہنے والوں کے ووٹوں کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔

لیکن سیاسی وجوہات کی بنا پر بھی نمائندگی میں ہیرا پھیری کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ابتدائی سوویت یونین نے دیہی قدامت پرستی پر قابو پانے کی دانستہ کوشش میں شہری باشندوں کو پانچ گنا زیادہ نمائندگی دی۔ امریکی سیاست دانوں کی بھی ایک طویل تاریخ تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو 'محفوظ' رکھنے کے لیے عجیب و غریب شکل والے انتخابی اضلاع تشکیل دیتے تھے۔ (ایسے ہی ایک ضلع کا نقشہ، جو 1812 میں میساچوسٹس کے گورنر ایلبرج گیری کے زیر نگرانی بنایا گیا تھا، ایک سیلامینڈر (چھپکلی نما ایک جانور) کی طرح نظر آیا— جس سے ہمیں 'گیری مینڈر' کی اصطلاح ملی ہے۔)

جمہوریت مساوات کو فروغ دیتی ہے

جمہوری نظاموں کو اکثر افراد کی سیاسی (یا 'شہری') مساوات، اور وقار پر زور دینے کے لیے سراہا جاتا

ہے۔ لیکن دوسرے نظاموں میں بھی سیاسی مساوات ہو سکتی ہے۔ اور ہم پھر بھی لوگوں کے وقار کا احترام کر سکتے ہیں، چاہے ہم انہیں حق رائے دہی نہ بھی دیں۔

یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جمہوری شرکت خوداعتمادی اور خود اظہار خیال کو فروغ دیتی ہے۔ لیکن خاص طور پر اِن مقاصد کے لیے ووٹنگ سسٹم بنانا عجیب ہو گا۔ مثال کے طور پر ہم شاید سماج دشمن قیدیوں کو محض ان کی عزت نفس بڑھانے کی امید میں ووٹ نہیں دینا چاہیں گے۔ اور خود اعتمادی اور خود کے اظہار خیال کے فروغ کیلئے انتخابات سے بڑھ کر کہیں بہتر طریقے ہیں۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ جمہوریت انصاف اور مساوات پیدا کرتی ہے اور چھوٹے گروہوں کے سیاسی اور سماجی غلبہ کو روکتی ہے۔ پھر بھی اس بات پر یقین کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ آسودہ حال گروہوں کا اس کے باوجود غیر متناسب اثر ہے۔ سینئر وزراء اور سرکاری افسران اوسط سے زیادہ امیر ہوتے ہیں، اور ان کی صفوں میں مہنگے اسکولوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ متوسط طبقے کو حقیقت میں پنشن، اسکول اور صحت کی دیکھ بھال جیسی ریاستی خدمات سے غریبوں کی نسبت زیادہ فائدہ ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن پھر وہ سیاسی بحث پر حاوی ہو جاتے ہیں، جس سے انہیں اپنے حق میں سیاسی فیصلوں کو محفوظ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ایک وجہ ان کا اثر و رسوخ ہو سکتا ہے کہ بہت سے ممالک میں ریاستی شعبہ اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ ضرورت سے کہیں زیادہ بڑا اگر اس کا واحد مقصد نسبتاً کم لوگوں کو نقد رقم اور خدمات فراہم کرنا تھا جو دراصل ان پر انحصار کرتے ہیں۔

جمہوریت کمیونٹی کا احساس فراہم کرتی ہے

ایک اور دلیل یہ ہے کہ جمہوریت 'برادری کا احساس' فراہم کرتی ہے اور 'ہم آہنگی' پیدا کرتی ہے۔ لیکن کمیونٹی یا اپنائیت کا احساس کلبوں، خیراتی اداروں، گرجا گھروں، سپورٹ گروپس اور سول سوسائٹی کے دیگر تمام اداروں میں لوگوں کی شرکت سے زیادہ ممکن ہے۔ اور جب کہ منتخب نمائندہ حکومت یقیناً

پر امن طریقے سے اجتماعی فیصلے کرنے میں مددگار ہوتی ہے لیکن یہ بمشکل ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ انتخابات اور قانون سازی کے مباحثے مختلف اور مخالف مفاد پرست گروہوں کے درمیان مقابلے ہوتے ہیں۔ وہ بہت تلخ بھی ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ جیتنے والوں کے پاس ہارنے والوں پر اپنا نظریہ مسلط کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

اقتصادی منڈیوں میں لوگ اپنے لیے، نہ کہ دوسروں کیلئے، سامان اور خدمات کا انتخاب کرتے ہیں۔ مختلف لوگ اپنی پسند کے مطابق انتخاب/چوائس کر سکتے ہیں۔۔ ایپل یا اینڈ رائیڈ، چائے یا کافی، سرخ یا نیلا۔۔ اور ان کے اس طرح کے انتخاب سے دوسروں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم سیاسی انتخاب سب کے لیے کیے جاتے ہیں۔ جب اکثریت امیدواروں کے ایک مخصوص سیٹ کو ووٹ دیتی ہے تو سب کو نتیجہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ جب حکمراں پارٹی کسی پالیسی پر، مثال کے طور پر نئی سڑک یا ہوائی اڈے کی تعمیر کے حوالے سے، کوئی فیصلہ کرتی ہے تو سب کو اسے قبول کرنا ہو گا، بشمول ان لوگوں کے جن کے گھر اور ذریعہ معاش اس عمل میں منہدم ہو جائیں گے۔

سیاسی فیصلوں کی نوعیت، کہ ان کی پابندی یا ان پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس حقیقت کہ اکثریت بہت سی چیزوں کے بارے میں وسیع پیمانے پر فیصلے کر سکتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ دوسرے لوگوں کے انتخاب/چوائس آپ کی اپنی زندگی اور فلاح و بہبود پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ جیسا کہ امریکی فلسفی جیسن برینن (2016) 'آگینسٹ ڈیموکریسی' میں نشاندہی کرتے ہیں کہ سیاست آپ کے پڑوسیوں کو دوست کی بجائے ممکنہ دشمنوں میں بدل دیتی ہے۔ یہ 'کمیونٹی کے احساس' کے بالکل برعکس ہے۔

جمہوریت ہمیں برے حکمرانوں سے بچاتی ہے

انسانی تاریخ کے بیشتر حصے میں ہماری زندگیوں پر جنگجوؤں، بادشاہوں، زاروں، شہنشاہوں، سرداروں،

اشرافیہ، لاڈلوں، محافظوں، آمروں اور ان کی طرح کے دیگر آمروں کی حکمرانی رہی ہے۔ اکثر ان حکمرانوں کو ہماری زندگی اور موت کا اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ جمہوری نظام یقینی طور پر لیڈروں کے لیے طاقت جمع کرنا یا طاقت کا بے دریغ اور معتصبانہ استعمال مشکل بنا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سیاست دانوں اور عہدیداروں کے اپنے بھی ذاتی مفادات ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنی حیثیت اور تنخواہوں میں اضافے یا عوامی فنڈز کو اپنے حامیوں کی طرف موڑنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جمہوری عمل انہیں ان مفادات میں ملوث ہونے کی طاقت اور ظاہری جواز فراہم کرتا ہے چاہے اس عمل میں دوسرے لوگوں کے مفادات کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ یہ (جمہوری عمل) ہمیں برے حکمرانوں سے بچانے کے بجائے ان کو اپنی جانب راغب بھی کر سکتا ہے۔

نہ ہی ہم جمہوریت کی انصاف کی فراہمی پر ہمیشہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ یہ ہمیں ہمارے رہنماؤں کے بدترین اور من مانے اقدامات سے بچا سکتی ہے۔ لیکن تمام اجارہ داریوں کی طرح، یہ بھی سست اور مہنگی ہو سکتی ہے۔ اور چونکہ یہ ریاست کا ہی حصہ ہے تو ان لوگوں کے مفادات کی تکمیل کے لیے انصاف کو توڑا مروڑا جا سکتا ہے ج کا حکم ریاست پر/میں چلتا ہے۔ بالآخر ہماری جان، مال، آزادی اظہار اور دیگر بنیادی حقوق کا سب سے یقینی تحفظ جمہوریت یا عدالتیں نہیں کر سکتیں بلکہ ایسا ان لبرل اقدار کی بدولت ممکن ہے جو عام عوام میں مقبول ہوں۔ اگر اپنے حقوق کو زندہ رکھنا ہے اور جمہوریت سے زیادہ سے زیادہ فوائد ہم سب تک پہنچانے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ لبرل اور جمہوریت پسند ان اقدار کی وضاحت کریں اور عوام میں ان کی مقبولیت کے فروغ کیلئے کام کریں۔ اور ہمیں خود بھی جمہوری فیصلہ سازی کے عمل میں موجود فالٹ لائنز سے پوری طرح آگاہ رہنا چاہیے۔

جمہوری فیصلے کیسے کیے جاتے ہیں؟

انیسویں صدی کے جرمن چانسلر اوٹو وان بسمارک نے ایک بار یہ تبصرہ کیا تھا کہ اگر آپ کو قوانین یا ساسیجز/چٹنیاں پسند ہیں تو آپ کو کبھی بھی ان میں سے کسی ایک کو بنتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اور بالیقین جمہوریت معاملات کا فیصلہ جس طرح سے کرتی ہے اس بارے میں پریشان ہونے کی اچھی خاصی وجوہات ہیں۔ جمہوریت میں بہت سے افراد کی رائے کو اجتماعی فیصلوں کے ایک مجموعہ میں ڈھالنا اور اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں بھی اس بات سے آگاہ ہونے کی ضرورت ہے کہ یہ عمل کہاں، کیسے اور کیوں ناقص/نامکمل ہو سکتا ہے، مطلب اس کی حدود و قیود کے بارے میں آگاہی ضروری ہے۔

انتخابات

مثال کے طور پر امیدواروں یا پالیسیوں کے درمیان انتخاب کے طریقوں کے طور پر انتخابات کی واضح حدود ہوتی ہیں۔ اول تو وہ کبھی کبھار ہی ہوتے ہیں؛ کبھی کبھی صرف ہر چار سال، پانچ، یا اس سے زیادہ سال۔ (تجارتی بازار میں اس کے برعکس ہم کسی بھی دن کی کسی بھی گھڑی اپنی پسند کی مصنوعات کا انتخاب کر سکتے ہیں۔) انتخابات ووٹروں کو جو چوائس یا انتخاب پیش کرتے ہیں وہ بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ مختلف اور پیچیدہ عوامی مسائل کی ایک بڑی تعداد ووٹرز کو پیکج کے طور پر پیش کی جاتی ہے جو شاید صرف دو یا تین امیدوار پیش کرتے ہیں۔ (ایک بار پھر، بازار ہمیں صرف چند پیکجز کی بجائے انفرادی مصنوعات کی وسیع رینج برائے انتخاب پیش کرتا ہے۔) پھر، اکثریت کے فیصلے ہر ایک پر مسلط کئے جاتے ہیں۔

'چٹان، کاغذ، کینچی' کا تضاد (یہ ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر سیدھے سادے کھیل کے

بھی کبھی کبھی بڑے پیچیدہ نتائج نکل آتے ہیں) بھی ہے۔ ووٹر ایک امیدوار کو دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں (جیسے کاغذ کو چٹان پر) اور پھر اس دوسرے امیدوار کو تیسرے پر (جیسے قینچی پر چٹان کو)۔ لیکن پھر وہ تیسرے (قینچی) کو پہلے (کاغذ) پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے جس ترتیب سے ووٹ لیے جاتے ہیں اس سے نتائج میں بہت فرق پڑ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس اور دیگر ممالک میں، جہاں ابتدائی ووٹنگ راؤنڈ کے سرکردہ امیدوار 'فائنل رن آف' (مقابلے) میں جاتے ہیں، یہ عام بات ہے کہ کوئی امیدوار پہلے راؤنڈ میں سب پر برتری حاصل کر لے لیکن دوسرے راؤنڈ میں پیش کردہ بائنری (ایک بمقابلہ ایک/یعنی دو افراد کے مابین) انتخاب میں مکمل شکست کھا جائے۔

انتخاب کرنے والے/ووٹرز

انتخاب کنندگان کے پاس مختلف محرکات کا ایک پورا سلسلہ ہوتا ہے۔ وہ ایک خاص پارٹی کے، خواہ مسائل یا ایشوز کچھ بھی ہوں، تاحیات حامی ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ محض حکمران جماعت کیلئے پریشانی کا باعث بننا چاہتے ہوں۔ یا وہ صرف کسی مقامی یا ذاتی تشویش، جیسے کہ قریبی ہسپتال کی بندش، پر ووٹ دے سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے ووٹ ہی نہ دیں جو وہ واقعی چاہتے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ حکمت عملی کے تحت ایک ایسے امیدوار کو ووٹ دیں جسے وہ ناپسند کرتے ہیں تاکہ اپنے اُس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ امیدوار کو باہر رکھ سکیں۔ یا ایسے بھی ہو سکتا کہ وہ مسائل بارے مکمل طور پر الجھن کا شکار ہوں لیکن پھر بھی ووٹ دینا اپنا فرض سمجھتے ہوں۔ (ایک حیرت انگیز تعداد اس وقت تک اپنا ذہن نہیں بنا پاتی جب تک کہ وہ ووٹنگ بوتھ میں اور بیلٹ پیپر ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔)

انتخابات مثالی، عقلی عمل نہیں جس میں سوچ سمجھ کر، باخبر، غیر جانبدار رائے دہندگان دورِ حاضر کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے بعد اسے ووٹ دیتے ہیں جس کو وہ مجموعی طور پر ملک کی طویل المدتی بھلائی کے لیے بہترین سمجھتے ہیں۔

امیدوار

کوئی سیاست دان خواہ جتنا بھی بے لوث ہو، عہدے تک پہنچنے اور کچھ حاصل کرنے کے لیے اسے بھی ووٹ اکٹھے کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے یہ 'ووٹ کا مقصد' ان کے لیے ایک بڑا محرک ہے جو ایک بار پھر فیصلہ سازی کے عمل کو بگاڑ دیتا ہے۔

مثال کے طور پر سیاست دانوں کی توجہ 'اوسط/معتدل' (میڈین یا سینٹرسٹ۔۔۔ جو کٹر لبرل ہو نا قدامت پسند) ووٹروں پر مرکوز رہتی ہے۔ بالآخر سیاسی انتہاؤں کے مقابلے میں اس کے مرکز میں کہیں زیادہ ووٹرز ہوتے ہیں، اور انتہا پسندوں کے مقابلے میں انہیں قائل کرنے کا، اور اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ کرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جب امیدوار اور پارٹیاں سبھی اپنی توجہ مرکز پر ہی مرکوز رکھیں تو ووٹرز، خاص طور پر وہ لوگ جو مضبوط لیکن غیر معتدل خیالات و نظریات رکھتے ہیں، حقیقی انتخاب/چوائس سے محروم ہوجاتے ہیں۔

سیاست دان لابی گروپس پر بھی پوری توجہ مرکوز رکھتے ہیں جو اپنی مضبوط ترغیب اور تنظیم کی وجہ سے انہیں بڑی تعداد میں ووٹ فراہم کرسکتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ دوسرے مفاداتی گروپوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ یہ 'خاموش اکثریت' ہی ہے جسے پھر نتائج بھگتنا پڑتے ہیں اگرچہ اس 'خاموش اکثریت' کا اثر رسوخ بہت کم ہوتا ہے۔

قانون ساز

اس لیے اس عمل کے ذریعے منتخب کردہ نمائندے کسی بھی طرح سے عوامی مفادات کے محافظ نہیں ہیں۔ وہ اپنی نشست سنبھالنے سے پہلے ہی سمجھوتہ کرلیتے ہیں۔ انہیں مفاد پرست گروہوں، جن کے وہ حمایت یافتہ ہوتے ہیں، اور پارٹی سربراہان کے ساتھ، جو ان کو پارٹی ٹکٹ دے چکے ہوتے ہیں، کئے گئے وعدے پورے کرنے ہوتے ہیں۔

ان کا مقننہ کے ذریعے اپنی پالیسیوں کو آگے لے جانا بھی اصولی کی بجائے عملیت پسندی پر مبنی ایک عمل ہے۔ اس کے لیے انہیں 'لاگ رولنگ': ایک 'آپ میری پالیسی کو ووٹ دیں میں آپ کی پالیسی کو ووٹ دوں گا' والا تبادلہ۔ مثال کے طور پر ایک نمائندہ اگلے نمائندے کی ایسی تجویز کو، کہ اس کے ضلع میں نیا سکول یا ہسپتال بنایا جائے، صرف اس لئے ووٹ دے سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ اس حمایت کا بدلہ چکا سکتا ہے نہ کہ اس بنا پر کہ اسے بھی اس سکول یا ہسپتال کی ضرورت یا میرٹ کا یقین ہوتا ہے۔ اسی طرح قانون سازی کے بڑے اقدامات کیلئے درکار حمایت حاصل کرنے کیلئے شاید انہیں یکجا کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔ مثال کے طور پر 1950 کی دہائی کے اوائل میں امریکی صدر ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور نے بین ریاستی شاہراہوں کے منصوبے بنائے تاکہ ان سے ریاستوں کی ایک اکثریت کو فائدہ پہنچے۔ سینیٹرز اور نمائندوں نے اپنی اپنی ریاست میں بہتر سڑکوں کے لیے ووٹ دیتے ہوئے موثر طریقے سے (سڑکوں کے) اس پورے نیٹ ورک/جال کو ووٹ دیا خواہ وہ اسے اچھا سمجھتے تھے یا برا۔ اس کے برعکس 2008 کے ہنگامی حالات میں پریشان حال امریکی بینکوں کو بیل آؤٹ کرنے کیلئے جب 'TARP' بل کانگریس میں پیش کیا گیا تو یہ صرف دو صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن چونکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ اس بل کو بس پاس ہی ہونا ہے اس لیے نمائندوں نے اپنی حمایت کے بدلے ہر طرح کی مراعات اور فوائد کا مطالبہ کیا۔ یوں یہ بل 451 صفحات پر ختم ہوا جو سوت بنانے والوں، شراب کشید کرنے والوں، ماہی گیری بیڑے، موٹر سپورٹس کمپلیکسز، ریہاں تک کہ لکڑی کے تیر بنانے والوں پر عائد ٹیکس میں چھوٹ جیسی رعایتوں سے بھرا ہوا تھا۔

پیشہ ور/تجربہ کار سیاست دان اور بیوروکریٹس لابنگ اور پریشر گروپوں کی طرف سے فراہم کی جانے والی مراعات پر ردعمل ظاہر کرتے ہیں تاکہ حکومتی سرگرمیوں میں مسلسل اضافہ ہو سکے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے قانون سازی کو منسوخ کرنے کا (جس کے نتیجے میں حکومتی سرگرم بڑھنے کی بجائے کم ہو سکے) کوئی اہم عمل کب ہوا ہے؟-

کریگ اسمتھ اور ٹام میئرز (2011)،'ڈیمو کریسی اینڈ دی فال آف دی ویسٹ'

حکام/آفیشلز

اس تمام قانون سازی کو عملی جامہ پہنانے کے ذمہ دار افسران بھی بے لوث فرشتے نہیں ہوتے۔ وہ شاید عوام کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کریں لیکن ان کے اپنے ذاتی مفادات بھی تو ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر وہ اپنے ادارے کا دائر کار بڑھا سکیں تو ان کے بجٹ، تنخواہ، حیثیت، ملازمت کے تحفظ اور ترقی کے امکانات، سب بہتر ہو سکتے ہیں۔

اور وہ اپنے مفادات دوسرے طریقوں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر قوانین اپنے اثر کے لحاظ سے وسیع ہوتے ہیں، اور اکثر یہ فیصلہ کرنے کے لیے، کہ قطعی اصول کیا ہونے چاہئیں اور ان قوانین کی کس طرح تشریح اور ان پر کیسے علدرآمد کیا جائے، ضابط/نگران جیسے حکام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے متعلقہ سرکاری شعبے میں مہارت (شاید قانون سازی کرنے والے سیاستدانوں سے بھی زیادہ) کی بدولت یہ اہلکار آسانی سے قانون میں پیچیدگی پیدا کر سکتے ہیں جس کے بعد اس پر عملدرآمد کے لیے مزید اہلکاروں/حکام کی ضرورت ہوتی ہے۔

قوانین کی تشریح اور ان پر عملدرآمد کے حوالے سے بھی یہ خود کو ایک طرح کی آزادی اور صوابدیدی اختیار دے سکتے ہیں جس سے ان کی اہمیت میں اضافہ اور فیصلہ سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے کیونکہ کاروبار اور عوام ان کی قواعد کی تشریح یا یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت پر انحصار کرتے ہیں کہ ٹھیکے، گرانٹس یا لائسنسز کس کو ملنے چاہئیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے فیصلوں کے لیے رشوت یا مراعات بھی لے سکتے ہیں۔

سیاسی انحصار کرنے والے

میڈیا، لابی گروپس، تھنک ٹینکس، اور وہ لوگ جو حکومتی اخراجات پر انحصار کرتے ہیں، سبھی کا مفاد

اجتماعی فیصلہ سازی کے عمل کو تحفظ اور وسعت دینے میں ہے۔

مثال کے طور پر براڈ کاسٹروں کو 24 گھنٹے کی خبروں کے چکر کو پورا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی خوش قسمتی کہ سیاست دان اپنے خیالات اور پالیسیوں کا پرچار کرنے کیلئے بے تاب رہتے ہیں۔ میڈیا بھی خصوصی خبروں کی تلاش میں ہوتا ہے - اور ایک بار پھر حکومتی سیاست دان انہیں اس طرح مایوس نہیں کرتے کہ سرکاری اعلان سے قبل ہی پالیسیاں 'لیک' کر دیتے ہیں تاکہ قبل اس کے کہ ان کے مخالفین کو اصل صورتحال کا ادراک ہو عوام اس معاملے پر ان کی آراء اور موقف کو جان سکیں۔

تھنک ٹینکس اور مہمات چلانے والے (کمپین) گروپ شاید خود کو ماہرین کے طور پر پیش کریں اور غیرجانبداری کا دعویٰ کریں، لیکن اپنے مفادات کو وہ بھی اس بحث میں متعارف کراتے ہیں۔ مہمات چلانے والے گروپس، جن کی زیادہ توجہ کسی ایک اہم مسئلے پر مرکوز ہوتی ہے، اس کے لیے زیادہ عوامی اخراجات یا ٹیکس میں چھوٹ کا مطالبہ کر سکتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ ٹیکس دہندگان پر اس کے کیا عمومی اثرات مرتب ہوں گے۔

آخر میں، ایسے افراد ہیں جن کا انحصار ریاست پر ہوتا ہے۔ سرکاری ملازمین ووٹرز کا ایک بڑا گروپ ہے، ایک ایسا گروپ جو شاید ہی چھوٹی حکومت اور قلیل بیوروکریسی جیسے اقدام کی حمایت کرے، یعنی اس کے حامیوں کو ووٹ دے۔ لیکن لاکھوں لوگ اور بھی ہیں جیسے پنشنرز، سرکاری وظیفہ لینے والے، اور وہ جو سرکاری اداروں کو (ضروری اشیاء) سپلائی کرتے ہیں۔ کچھ ترقی یافتہ ممالک میں ایسے لوگوں کی تعداد ملک کی آبادی کی اکثریت پر مبنی ہے جو اپنی آمدنی کے نصف یا اس سے زائد کے لیے ریاست پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کا مفاد ریاست کو وسعت دینے میں ہے نہ کہ ٹیکس دہندگان کا پیسہ بچانے میں۔

خلاصہ

جمہوریت بہت سے حوالوں سے دیگر، زیادہ مطلق العنان حکومتوں سے بہتر ہے، لیکن ہمیں اس کے بارے میں زیادہ رومانوی نہیں ہونا چاہیے۔ جب ہم 'جمہوریت' اور جمہوری فیصلہ سازی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو در حقیقت ہم سیاست اور سیاسی فیصلہ سازی کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ اکثر لوگ اتفاق کریں گے، سیاسی عمل ناقص و نامکمل ہوتا ہے۔

اس لئے جمہوریت سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس حوالے سے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے کہ یہ دراصل کام کس طرح کرتی ہے۔ ہمیں اس کی فالٹ لائنز/خامیوں بارے چوکنا رہنا چاہیے اور، جہاں ممکن ہو، ان خرابیوں کو درست کرنے یا کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو اس کے خاطر خواہ مفید نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔

زیرِ دباؤ جمہوریت

اگرچہ جمہوریت کے نظریے سے محبت کرنے کا دعویٰ تقریباً ہر کوئی کرتا ہے لیکن بہت سے لوگ اس کے حقیقی نفاذ کے بارے میں بہت زیادہ شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ جمہوریت سے محبت تو کرتے ہیں لیکن سیاست سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ وہ جمہوریت کو سب کی شمولیت/شرکت اور عوامی مسائل پر کھلی بحث،اور پھر حتمی طور پر متفقہ پالیسیوں پر سوچ سمجھے، منصفانہ اور پرامن عمل درآمد کا ایک صاف شفاف طریقہ تو سمجھتے ہیں لیکن انہیں سیاست اور سیاستدان کو دوغلے پن، خودغرضی اور مفاد پرستی سے بھرے بھی نظر آتے ہیں۔ مختلف پیشوں پر عوامی اعتماد کے سروے میں سیاست دان ہمیشہ فہرست کے عین نیچے یا پاس پاس ہی آتے ہیں۔

اس صورتحال کیلئے صرف سیاستدانوں کو ہی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ان کے لیے لاکھوں لوگوں کے متنوع خیالات کو ایک ایسی پالیسی میں ڈھالنا آسان نہیں ہوتا جس کی ہر کوئی حمایت کر سکے۔ یہ آج کے اس جدید دور میں، جبکہ سفر اور نقل مکانی نے بہت سی آبادیوں کو مزید متنوع بنا دیا ہے، اور بھی مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خود سیاستدان بھی مضبوط لیکن متصادم خیالات کے حامل ہوتے ہیں جو ان کے مابین گرما گرم مباحثوں کا باعث بنتے ہیں۔ اس سے عوام کو یہ تاثر مل سکتا ہے کہ سیاستدان سیاسی مفاد کو اصول پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بھی کہ وہ اصول کی بجائے پوائنٹ سکورنگ میں زیادہ دلچسپی

لیتے ہیں۔ کسی طرح اتفاق رائے تک پہنچنے کے لیے اکثر انہیں سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں جس سے وہ (عوام کو) اصولوں سے مزید عاری نظر آتے ہیں۔

یہ جمہوریت کا خاصہ ہے نا ہی ایسا مسئلہ ہے جو جمہوریتوں میں بد تر ہے۔ اس کے بر عکس جمہوریت عوامی مباحثوں میں دیانت اور صاف گوئی کو فروغ دے سکتی ہے۔ دوسرے نظاموں کے مقابلے میں نسبتاً لبرل جمہوریتوں میں سیاست دان عام طور پر زیادہ ایماندار اور کم بد عنوان ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر برلن میں قائم این جی او ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل (2019) نے جن پندرہ ممالک کو سب سے کم بدعنوان قرار دیا ہے ان میں سے چودہ ممالک کی درجہ بندی اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ (2019) نے 'مکمل جمہوریت' کے طور پر کی ہے۔ (سنگاپور ان میں ایک استثنیٰ ہے جسے 'ناقص جمہوریت' قرار دیا گیا ہے۔)

سیاست کے قائم شدہ معمولات/قاعدے کارد

دوسرے لفظوں میں جمہوریتوں میں سیاست دان نسبتاً زیادہ باکردار ہوتے ہیں۔ لیکن پھر جمہوریتوں میں (شفافیت و رسائی کی وجہ سے) ایسا ہوتا ہے کہ اِن کے اعمال و افعال عوام کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور جن کی طرف سے تنقید کا سامنا بھی اِنہیں ہی زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ ہی تنقید کا سب سے زیادہ نشانہ واقعی بنتے بھی ہیں۔

بہت سے ممالک میں سیاست پر عوامی تنقید انتخابات میں ٹرن آؤٹ میں کمی اور نام نہاد (اور بعض اوقات انتہائی) پاپولسٹ تحریکوں اور پارٹیوں کی بڑھتی ہوئی حمایت کا باعث بنی ہے جو پھر مرکزی دھارے کے سیاست دانوں کے خلاف بخوشی اس مایوسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پاپولسٹ لیڈر اپنے آپ کو عام لیکن اکثر نظر انداز کردہ عوام کے مفادات کا دفاع کرنے والے حقیقی جمہوریت پسند سمجھتے ہیں۔ وہ امیگریشن یا فلاح و بہبود جیسے مسائل کی پیچیدگیوں کو غلط بیانی سے کام لے کر چھپا سکتے ہیں۔۔ لیکن عوام کے پاس بھی ایسی پیچیدگیوں کے لیے وقت یا حوصلہ کہاں ہوتا ہے۔

بدلتے ہوئے عالمی حالات

معاشی بحرانوں نے بھی جمہوری سیاست سے عوامی مایوسی کو ہوا دی ہے۔ لبرل جمہوریت کو عام طور پر معاشی ترقی سے وابستہ کیا جاتا ہے: جیسا کہ آسیما گلو اور رابنسن (2012) نے دیکھا کہ معاشی کامیابی صحیح معاشی اور سیاسی اداروں کی مدد سے آتی ہے۔ لیکن 8-2007 کے مالیاتی بحران کے بعد مغرب کی معاشی سست روی، 2020 کی کورونا وباء کا معاشی خلل، اور سیاست دانوں کی ان بحرانوں کو سنبھالنے میں ظاہری نااہلی نے جمہوریت پر عوام کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔

مایوسی کا ایک اور ممکنہ ذریعہ یہ بھی ہے کہ کچھ عالمی مسائل قومی سیاست کے کنٹرول یا فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں سے باہر ہو گئے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلی ان میں سے ایک ہے: لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ان کے اپنے ملک میں کاربن کے اخراج کو کم کرنے کے لیے ووٹ دینا تب تک بے معنی ہے جب تک کہ دوسرے ممالک ایسا نہ کریں۔ سلامتی، دہشت گردی اور نقل مکانی کے لیے بھی بین الاقوامی سطح پر مربوط حل کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

بین الاقوامی ادارے ان عالمی مسائل سے متعلق خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔ مثال کے طور پر ماحولیاتی پالیسی یا مسائل کے حوالے سے یورپی یونین، اقتصادی استحکام کو مربوط کرنے کی کوششوں میں مرکزی بینک، اور عالمی تنازعات کے حل کیلئے بین الاقوامی عدالتیں پیش پیش رہتی ہیں۔ لیکن ان اداروں کی بھی سخت حدود یا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ان میں اس ثقافتی اور لسانی شناخت کا فقدان ہوتا ہے جس سے ووٹر خود کو جوڑ سکے (یعنی ووٹر ان سے خود کو لاتعلق سمجھتا ہے)، اور ان (اداروں) کے ممبر ممالک کے مقاصد اور طریقوں میں بھی سخت اختلاف پایا جاسکتا ہے۔ اس لیے لوگ ان اداروں کو دور دراز اور غیر جوابدہ سمجھتے ہیں، اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کے بجائے ان کے اپنے ملک کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اس طرح کے اقدامات کر سکے۔ (ووٹرز کی یہ ناراضگی یا عدم اطمینان) ایک ایسی چیز ہے پاپولسٹ/بازاری لیڈر جس کا بخوشی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ

زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت سمیٹ سکیں۔

سیاسی نظام میں تبدیلیاں

ایک اور چیلنج یہ درپیش ہے کہ سیاسی عمل کے ذریعے کیے جانے والے فیصلوں کے بڑھتے ہوئے حجم اور پیچیدگی نے سیاست کو پیشہ ور سیاستدانوں کی ایک سرگرمی بنادیا ہے۔ عام شہری اکثر محسوس کرتے ہیں کہ اس حوالے سے ان کا کردار بہت مختصر ہے۔ بہت کم لوگ ووٹ ڈالنے کے علاوہ کچھ کرتے ہیں (یعنی صرف ووٹ ڈال کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیتے ہیں)۔ صرف ایک چھوٹی سی اقلیت پارٹیوں یا کمپین گروپوں میں شامل ہوتی ہے۔ اب چونکہ پارٹیوں کے اپنے ارکان غائب ہو چکے ہیں، یا بہ الفاظ دیگر لوگ پارٹیوں کی رکنیت لینے میں دلچسپی نہیں لیتے، اس لئے رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کیلئے یہ جماعتیں چالاکی سے کی جانے والی تشہیر، کرشماتی شخصیتوں، دلکش جملوں اور اصل واقعات و معلومات کو توڑنے مروڑنے پر انحصار کرنے لگی ہیں جس کی وجہ سے ووٹروں کو یہ شک ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ جھوٹ بولا جارہا ہے۔

جدید میڈیا ٹیکنالوجی سیاست دانوں کو زیادہ مرئی (دیکھنے کے قابل) بنا سکتی ہے لیکن اس کی توجہ عام پارلیمنٹیرین کی بجائے زیادہ تر پارٹی رہنماؤں پر مرکوز ہوتی ہے۔ یہ وزراء اور وزرائے اعظم ہی ہوتے ہیں جو ٹی وی مباحثوں میں نظر آتے ہیں، (اور یوں) اپنی حیثیت اور اختیار کو بڑھاتے اور اپنی جماعتوں پر اپنا کنٹرول مستحکم کرتے ہیں۔ اس طرح اختیار ان لوگوں کو منتقل ہو جاتا ہے جو اقتدار میں ہوتے ہیں (ایگزیکٹو) اور ان نمائندوں سے دور جنہیں ان (اسی ایگزیکٹو) پر نظر رکھنا ہوتی ہے (ان پر چیک اینڈ بیلنس رکھنا ہوتا ہے)۔

دریں اثناء انتخابات کی بڑھتی ہوئی لاگت پیسے کو مزید اہم بناتی ہے جس سے عوام یہ سوال پوچھنے پر مجبور جاتے ہیں کہ ان کی سیاست کو فنڈ کون کر رہا ہے۔ اپنے ووٹ سے سیاست دانوں کو (دفتر سے) باہر کر

کے وہ دیکھتے ہیں کہ انہیں ایک ایسی کمپنی میں پرکشش ملازمت مل گئی ہے جو سیاسی اور ریگولیٹری نظام کے بارے میں ان کے اندرونی علم سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ اس سے یہ عوامی تاثر مزید قوی ہو جاتا ہے کہ سیاستدانوں کو صرف اپنے مفادات میں ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ ایک بار پھر، یہ معاملہ جمہوریت کے ساتھ خاص نہیں صرف اتنا ہے کہ جمہوری نظاموں میں یہ چیز/امر زیادہ واضح نظر آتا ہے۔

حکومت کی ترقی (وسعت) اور پیچیدگی کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ فیصلے منتخب نمائندوں کے بجائے عہدیداروں اور نام نہاد 'ماہرین' کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ سیاست دانوں کے پاس ان تمام پیچیدہ قانون سازیوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا وقت کم ہی ہوتا ہے جو ان کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ درحقیقت، جدید جمہوریتوں میں منظور کیے گئے بہت سے قوانین کے مسودے سرکاری ملازمین کے ذریعے تیار کئے جاتے ہیں اور وہ اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کی تشریح کے لیے الگ اضافی ماہرین اور نفاذ کے لیے مزید اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں سیاست دانوں کا اثر رسوخ مزید کم ہو جاتا ہے۔ جبکہ قانون سازی کا جائزہ لینے کے لیے جو پینلز بنائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کے لئے ماہرین کا انتخاب ماہرین تعلیم، ججوں یا سرکاری ملازمین کی اشرافیہ سے کیا جاتا ہے جو خود سیاست دانوں کے مقابلے میں عوام سے زیادہ دور اور الگ تھلگ ہوتے ہیں (مطلب انہیں عوام کے مسائل کا ادراک نہیں ہوتا)۔

ووٹرز میں تبدیلیاں

ووٹر بھی بدل گیا ہے۔ دولت میں مسلسل اضافے، وسیع تعلیم اور سفر کی آسان سہولیات سے طبقاتی اور ذات پات کی رکاوٹیں ختم ہو گئی ہیں۔ غریب و پسماندہ گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اب اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے امیر، یہاں تک کہ ناموری و شہرت کما سکتے ہیں اور مروجہ معاشی اور سیاسی اصولوں یا زنجیروں کو توڑ سکتے ہیں۔ لیکن پھر زوال پذیر صنعتوں سے وابستہ لوگوں کو یہ احساس ہونے

لگتا ہے کہ ان کی قدر میں کمی آئی ہے اور انہیں کوئی شمار میں نہیں لاتا جس کی وجہ سے قوم پرستی اور پاپولزم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ٹیکنالوجی سے میدانِ سیاست میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ مثال کے طور پر اب اکثر لوگ خبریں آن لائن ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا نے اقلیتوں کے لیے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ وہ اپنے ہم خیال دوسرے لوگوں کو تلاش کر سکیں اور سیاستدانوں کی مدد کے بغیر ایک دوسرے کا ساتھ دے سکیں۔ اور بہت سی خدمات (مثال کے طور پر، نشریات، یوٹیلیٹیز (سہولیات)، ٹیلی فون اور نقل و حمل) جو کبھی صرف سیاست دانوں کے زیر کنٹرول بڑے سرکاری ادارے ذریعے فراہم کرتے تھے اب چھوٹی، مسابقتی نجی فرموں کے ذریعے مختلف نئے طریقوں سے فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے کچھ اثرات بھی سامنے آئے ہیں۔ اول یہ کہ ان خدمات کو استعمال کرنے والے لوگوں کو اب سیاستدان کی اتنی ضرورت نہیں رہی ہے (سیاستدانوں کی اہمیت میں کمی)۔ دوئم لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ بجائے اس کے کہ سیاستدان ان کی جگہ فیصلہ کریں وہ خود سکول یا پنشن جیسی خدمات میں ویسا ہی انتخاب کیوں نہیں کر سکتے۔

عمر کے لحاظ سے آبادی میں فرق۔۔۔ مغرب میں 'بے بی بومر جنریشن' (دوسری جنگ عظیم کے بعد 1965ک پیدا ہونے والے) اور باقی دنیا میں 'میلینیئلز' (1980 کے اوئل سے لے کر 1990 کے اواخر تک پیدا ہونے والوں) کی بڑھتی ہوئی تعداد۔۔نے بھی رویوں کو متاثر کیا ہے۔ نوجوان نسل کو یہ شکایت ہے کہ سیاست پر غالب پرانی نسل نے سیاسی طاقت کا استعمال اپنے فائدے کے لیے کیا ہے۔ اس طرح پرانی نسل نے پنشن، سوشل انشورنس اور صحت کی مفت سہولیات جیسے فراخدلانہ فوائد کو ووٹ دیا ہے جس کی جزوی طور پر ادائیگی قرضے لے کر کی جاتی ہے جو پھر نئی نسل کو چکانا پڑتے ہیں۔ یہ نارمل سیاسی عمل سے مایوسی کا ایک اور ذریعہ/وجہ ہے۔

خلاصہ

ان تمام وجوہات کی بناء پر عوام اپنے جمہوری سیاست دانوں سے تیزی سے بیگانہ ہوتے چلے گئے ہیں۔ اس لیے غیر معروف جماعتوں کو عروج ملا۔ جمہوریت کی حمایت کرنے والوں کے لیے تشویش کی بات یہ ہے کہ موجودہ سیاسی طبقے کیلئے عوام کے منفی جذبات خود اس پورے جمہوری عمل سے مایوسی پر منتج ہو سکتے ہیں۔ لبرل جمہوریت کے خاطر خواہ فوائد کے پیش نظر یہ ایک سنگین مسئلہ یا بد قسمتی ہو سکتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم اِس مایوسی کے ماخذ کو سمجھیں اور ایسے طریقے تلاش کریں کہ ہم جمہوری سیاست کو عوام کے لیے مزید مناسب اور با معنی بنا سکیں۔

شرکت کا مستقبل

شرکت کی صورتیں

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جمہوریت کی خرابیوں یا پریشانیوں کا علاج عوامی شرکت/شمولیت کی نئی صورتوں سے کیا جاسکتا ہے۔ 'مبنی بر شرکت یا شمولیت پر مبنی' جمہوریت ان کا نظریہ ہے جو کہ بڑی حد تک پرانے طرز کی جمہوریت سے مماثلت رکھتی ہے جس میں شہری فیصلہ سازی میں براہ راست شامل ہوتے ہیں۔ وہ اس کا مقابلہ آج کے 'مجموعی/کل تعداد پر مبنی' طریقوں سے کرتے ہیں جن میں لوگوں کے ووٹوں کو شمار کرنے اور ان میں توازن ڈھونڈنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

ایک تجویز لازمی ووٹنگ کی ہے۔ اگرچہ یہ طریقہ معمولی سا "شمولیتی یا مبنی بر شرکت ہے" کہ اس میں لوگ زادہ سے زیادہ ایک ووٹ ہی ڈال سکتے ہیں تاہم (اس کے حامیوں کو) امید ہے کہ یہ عوامی بحث میں عوام کی وسیع پیمانے پر شمولیت کا محرک بن سکتا ہے۔ متعدد ممالک، بشمول آسٹریلیا، یوراگوئے، بیلجیئم اور لکسمبرگ، پہلے سے ہی لازی ووٹگ کا طریقہ رائج کر چکے ہیں اس کے باوجود اس امر کے شواہد کم ہیں کہ اس کا انتخابی نتائج یا عوامی بحث کے معیار پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

ایک اور تجویز براہ راست جمہوریت کا تصور ہے جیسے کہ ریفرنڈم اور ''Ballot Initiatives'' (قانون سازی پر رائے شماری کا اقدام)، جس میں ہر کوئی قانون سازی پر براہ راست ووٹ دیتا ہے۔ یہ طریقہ بھی پہلے سے ہی مختلف جگہوں میں رائج ہے۔ کچھ امریکی ریاستوں میں 'ویٹو' ریفرنڈم بھی ہوتے

ہیں جن کی مدد سے ووٹرز ناپسندیدہ قوانین کے نفاذ کا راستہ روکتے ہیں۔ کیلیفورنیا کی ریاست تو اپنے شہریوں کو قوانین حتیٰ کہ ریاستی آئین میں ترامیم تجویز کرنے کی بھی اجازت دے کر دو ہاتھ آگے چلی گئی ہے۔

تیسری حکمت عملی کو مشاورتی یا غور و فکر والی پولنگ لکھا جاسکتا ہے۔ اس میں لوگوں کے ایک گروپ کو، جو ایک وسیع آبادی کی نمائندگی کرتا ہے، منتخب کیا جاتا ہے اور پھر خاص معاملات یا موضوعات کے حوالے سے ان کی آراء و تاثرات جاننے کیلئے ان میں رائے شماری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو آراء جمع ہو جاتی ہیں ان پر ایک تفصیلی نشست کیلئے ویک اینڈ پر اس تمام گروپ کو ایک ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔ اس نشست کے دوران معاملات سے متعلق مختلف دلائل پر انہیں بریفنگ دی جاتی ہے۔ وہ آپس میں، اور ماہرین اور سیاست دانوں کے ساتھ بھی، مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور رائے شماری کرائی جاتی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ اصل پول کے نتائج پر اس معنی خیز نشست کا ان کی ابتدائی آراء پر کیا فرق پڑا ہے۔ اس کے پیچھے خیال یہ کارفرما ہے کہ اس طرح قانون سازوں کو عوام کی حقیقی اقدار اور ترجیحات کا بہتر ادراک ہوتا ہے۔

اس کی ایک قسم شہریوں کی جیوری ہے جہاں ایک چھوٹا لیکن متنوع نمائندہ گروپ جو عام طور پر 12 سے 24 افراد پر مشتمل ہوتا ہے، وہ ایک ساتھ بیٹھتے ہیں، آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں اور متعلقہ ماہرین سے سوالات کرتے ہیں جو انہیں موضوع سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں، اور سب زیر بحث مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ جن نتائج پر پہنچیں گے وہ نتائج نہ صرف وسیع پیمانے پر عوام بلکہ قانون سازوں کے فیصلوں پر بھی اثرانداز ہوں گے۔

بہت سے لوگ ڈیجیٹل جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں۔ تقریباً دو تہائی ایسے لوگ جو ووٹ نہیں دیتے، ان کا کہنا ہے کہ اگر انہیں یہ سہولت دستیاب ہو تو وہ آن لائن ووٹ ضرور دیں گے۔ ڈیجیٹل جمہوریت کے حامیوں کا کہنا ہے کہ آن لائن سسٹم ووٹروں کو ووٹ ڈالنے سے قبل مسائل اور

دلائل کے بارے میں تفصیلی و جامع معلومات فراہم کرتے ہیں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی پہلے سے ہی جمہوری عمل پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ آسٹریلیا 'MiVote' پلیٹ فارم کا آغاز کر چکا ہے جو پارلیمان میں زیر بحث تمام اہم مسائل پر رائے دہندگان کو مختلف قسم کے نقطہ نظر فراہم کرتا ہے۔ آئس لینڈ نے 2008 میں اپنی آئینی اصلاحات کو 'کراوڈ سورس' (عوام کو قانون سازی/ترامیم کی دعوت) کیا تھا۔ ایسٹونیا تو خود کو ایک 'ای نیشن' کہتا ہے۔ اور اب تو مشین لرننگ اور ترجمے کے نظام میں ترقی نے اس امر کو ممکن بنا دیا ہے کہ دنیا بھر سے لوگ بڑے پیمانے پر مباحثوں میں حصہ لے سکیں۔

لیکن کیا ٹیکنالوجی واقعی آگاہی سے بھرپور عوامی بحث کو فروغ دیتی ہے؟ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے: اگرچہ یہ لوگوں کو وسیع پیمانے پر معلومات تک رسائی فراہم کرتی ہے اور انہیں مختلف قسم کے مسائل پر ووٹ دینے کے قابل بناتی ہے (نہ کہ صرف عہدے کے لیے امیدواروں کا انتخاب)، لیکن پھر بھی افراد عقلی طور پر لاعلم ہی رہنا چاہتے ہیں کیونکہ ایک تو ان کے پاس وقت کی قلت ہوتی ہے، اور دوسرے اس حقیقت کی وجہ سے کہ ان کے انفرادی ووٹ کیا فرق پڑ سکتا ہے/ مطلب افرادی ووٹ کا اثر کم ہوتا ہے۔

شرکت کے حق میں دلائل

اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ فیصلہ سازی کے عمل میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شامل کیا جائے۔ اور اس کی دیگر اچھی خاصی وجوہات بھی ہیں۔ بہت سے لوگ سماجی فیصلوں میں شہریوں کی اس شمولیت کو ہی اچھا سمجھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس طرح لوگ مسائل کے بارے میں سوچنے پر مجبور، ااور ان کی سماجی بیداری میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ بہتر طور پر آگاہ ہوں گے تو بہتر فیصلے کر سکیں گے۔ اور یہ کہ ایسا کسی بھی پیمانے پر کیا جا سکتا ہے: حکومتیں اہم قومی معاملات پر پورے ملک کی رائے/آراء

لے سکتی ہیں، جبکہ ایک ہی عمارت میں رہائش پذیر کرایہ دار بھی یہ طریقہ اپنا کر یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس عمارت کا انتظام کیسے چلائیں گے۔

کچھ عملی دلائل یا وجوہات بھی ہیں۔ ووٹنگ کے روایتی پرانے طریقے جمہوریت کو زیادہ مرکوز، بوجھل، سست اور اس کے دائرہ کار کو محدود بنا دیتے ہیں۔ سیاست دانوں کے لئے ہر ایک کے خیالات کو مد نظر رکھنا، جس کی وجہ سے ایسی پالیسی بنے جو کچھ لوگوں کے لیے تو فائدہ مند لیکن دوسروں کے لیے نقصان دہ ہو، ممکن نہیں۔ مقامی سطح پر فیصلہ سازی تیز تر ہوتی ہے اور ایسی پالیسیاں بنتی ہیں جو مقامی لوگوں کے لیے زیادہ مناسب ہوتی ہیں اور اس لیے زیادہ مستحکم بھی ہوتی ہیں۔ پرانے طرز کی سیاست میں سیاستدان ووٹرز tک رسائی کیلئے صرف نعروں اور تیز جملوں کا ہی سہارا لے سکتے ہیں جبکہ آن لائن سسٹم انہیں متعلقہ معلومات سے بھری پوری ویب سائٹس تک رسائی فراہم کرتے ہیں۔ اس قسم کی شمولیتی جمہوریت مستحکم جماعتوں کے کنٹرول کو توڑ سکتی ہے، جس سے نئے خیالات کو پنپنے اور بدلتے ہوئے سماجی حالات پر تیز تر کارروائی کی جا سکتی ہے۔

شرکت کے خلاف عملی دلائل

ناقدین ان طریقوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ ن کا استدلال ہے کہ براہ راست جمہوریت کی تکنیک جیسے ریفرنڈم یا "بیلٹ انیشیئیٹیو" (بی آئی) کے باوجود بھی رائے دہندگان کو مسائل کے بارے میں جاننے اور ان پر غور و فکر کرنے میں وقت لگانا اور محنت کرنی چاہیے، اگرچہ ان کے انفرادی ووٹ کا اثر یا وزن پھر بھی کم ہوتا ہے۔ اور اگر رائے دہندگان پر یہ بھروسہ نہیں کر سکتے لکہ وہ شعوری فیصلے کریں گے تو پھر غالباً بہتر یہی ہو گا کہ حکومت ان کے بہتر باخبر و باشعور نمائندوں پر چھوڑ دی جائے۔ فرانسیسی انقلابی رہنما میکسیملین روبسپیئر (1794) نے لکھا۔ "جمہوریت ایسی ریاست نہیں جس میں عوام مسلسل جمع ہو کر خود عوامی معاملات کو چلاتے ہیں۔ جمہوریت ایک ایسی ریاست ہے جس میں

عوام بطور خود مختار حکمران جو خود اچھا کر سکتی ہے وہ خود کرتی ہے اور جو نہیں کر سکتی وہ اپنے نمائندوں کے حوالے کر دیتی ہے۔"

مزید بر آں، امریکی تجربہ بتاتا ہے کہ 'بی آئی' پر زیادہ تر مستحکم سیاسی جماعتوں کی اجارہ داری رہے گی کیونکہ ان کے پاس فنڈنگ اور مہم چلانے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ نیز 'بی آئی' غلط طور پر تیار (یعنی ڈیزائنگ میں نقص) ہوتے یا پھر ان کے فروغ کے پیچھے اکثر مفاد پرست گروہ ہوتے ہیں جو ٹیکس دہندگان کا استحصال یا حریف مفادات کو کم کرنا چاہتے ہیں - مطلب یہ ہے کہ ہر الیکشن میں کاروباروں کو اپنے لئے نقصان دہ یا ناکارہ تجاویز کو بے اثر کرنے کیلئے لاکھوں ڈالر خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ اور یہ نظام ایسے فیصلے یا نتائج بھی پیدا کرتا ہے جن میں کوئی مالی یا قانونی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

ریفرنڈم نمائندہ جمہوریت سے بظاہر متصادم نظر آسکتے ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ نمائندوں کو کام سونپ کر ووٹرز کو ہر مسئلے کا فیصلہ کرنے کی زحمت سے بچایا جائے۔ تو پھر ریفرنڈم ہوتے کس لیے ہیں؟ کیا ان کی مدد سے قانون بنائے جاسکتے ہیں؟ (اس صورت میں کچھ انتہائی متضاد اور غیر لبرل قوانین کے منظور ہونے کا خدشہ ہے)۔ کیا وہ نمائندوں کو ہدایات دیتے ہیں کہ ووٹ کیسے ڈالیں (اور اگر نمائندے اس کے خلاف/ برعکس ووٹ دیں تو کیا ہو گا)؟ یا وہ محض مشورے ہیں (ایسی صورت میں، رائے عامہ کے جائزوں پر ہی انحصار کیوں نہ کیا جائے)؟ اکثر ان سوالات کے کوئی واضح جواب نہیں ہوتے۔ تاہم اس کے باوجود کہ نمائندہ جمہوریت کے اندر ریفرنڈم کا صحیح کردار واضح نہیں ہو سکتا، ان کا ایک مثبت کام ضرور ہو سکتا ہے۔ امریکی ماہر تعلیم جان جی مٹسوسا کا (2004) کے مرتب کردہ شواہد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مقامی ریفرنڈم سیاسی تنازعات کو حل کرنے اور ٹیکس دہندگان کا پیسہ بچانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں، اور مددگار ہوتے بھی ہیں۔

جہاں تک ڈیجیٹل جمہوریت کا تعلق ہے تو ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ پھر بھی مستحکم جماعتوں اور اچھی فنڈنگ والے لابی گروپس کے گھر کی باندی رہے گی۔ اور کچھ شہریوں خاص طور پر بوڑھے لوگوں کی

آن لائن شمولیت تک رسائی کم ہو سکتی ہے جس سے سیاسی مساوات کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔
مشاورتی/غور و فکر والے نظاموں کے بارے میں جیسن برینن (2016) جیسے ناقدین کا کہنا ہے کہ وہ روایتی "ایگریگیٹ" (مجموعی/کل تعداد پر مبنی) طریقوں کے مقابلے میں بدتر فیصلے کرتے ہیں۔ دورو فکر والے گروہ اکثر نئے و نادر خیالات کو تلاشنے کی بجائے پہلے سے موجود نظریات کو ہی تقویت بخشتے ہیں۔ شرکاء بہ آسانی مضبوط خیالات رکھنے والے طاقتور افراد کے پیچھے چل سکتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر ایسی شخصیات ان کی قیادت کی باگ ڈور سنبھال لیتی ہیں۔ اصولی طور پر آزاد سہولت کاروں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ یہ معاملہ درست کریں۔ لیکن ناگزیر طور پر یہ خدشہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے کہ سہولت کار اپنے تعصبات کو بحث کا حصہ بنا دیں۔ دوسری طرف غیر معروف نظریات رکھنے والے کچھ لوگ شاید اجنبیوں کے سامنے اپنے خیالات بیان کرنے میں شرمندگی محسوس کریں اگرچہ بطور گمنام ووٹر وہ انہی نظریات کی حمایت پر مستعدی سے کمربستہ ہوں گے۔ لہٰذا موضوع کی طرف ایک بار آتے ہوئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ غور و فکر والے گروہ روایتی اور پسندانہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں جو (نتائج) وسیع و مکمل رائے عامہ کی نمائندگی نہیں کریں گے۔

اصولی طور پر شمولیت کے خلاف

ناقدین یہ بھی استدلال ہے کہ رسمی طریقوں سے شرکت یا شمولیت ان طریقوں سے زیادہ 'جمہوری' نہیں جو پہلے سے موجود ہیں۔ اس تناظر میں وہ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شہری پہلے سے ہی براہ راست، اور بڑی تعداد میں، سوشل اور دیگر میڈیا کے ذریعے رابطہ اور تبادلہ خیالات کرتے ہیں جو شمولیت یا شرکت کی ایک ایسی صورت ہے جو شہریوں کی کسی بھی جیوری سے کہیں زیادہ فوری اور وسیع ہے۔ اور یہ بھی واضح نہیں کہ شمولیت کے زیادہ رسمی طریقوں سے ووٹر فی الواقعی زیادہ باشعور اور سمجھدار بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لازمی ووٹنگ کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ اس کی مدد سے سیاسی

مسائل سے متعلق شہریوں کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے یا انتخابی نتائج پر کوئی اثر پڑا ہے۔
ناقدین کا مزید کہنا ہے کہ بہر صورت مسئلہ، "ایجوکیشن" نہیں "موٹیویشن" کا ہے؛ مطلب مسئلہ تعلیم کا نہیں ترغیب و تحریک کا ہے۔ ووٹروں پر ہر روز معلومات کی بمباری کی جاتی ہے جسے وہ اس لئے نظر انداز کرتے ہیں کہ ان کے اپنے بہت سے مسائل ہوتے ہیں جن کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں۔ اور لوگ ویسے بھی شمولیت کی خواہش کے لحاظ سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند ہی ہوتے ہیں جو پارٹیوں میں شامل ہو جاتے ہیں، کتابچے تقسیم کرتے ہیں، سیاسی میٹنگز میں شرکت کرتے ہیں یا کسی مقصد/کاز کے لیے رقم عطیہ کرتے ہیں۔ تو ہم یہ کیوں فرض کریں کہ اگر موقع مے تو ہر کوئی عوامی مسائل پر غور کرنا چاہے گا؟ اکثریت کیلئے یہ امر یا چیز خالی از دلچسپی ہوتی ہے، مطلب وہ اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔
آخر میں ناقدین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زیادہ تر لوگوں کے لیے رسمی انتظامات کے ذریعے شمولیت غیر مفید اور غیر موثر ہے۔ وہ اس کی قدر کریں گے نہ ہی اس کا احترام کریں گے، اور نہ ہی اس موقع کو دانشمندی سے بروئے کار لائیں گے۔ یہ ذاتی طور پر پہلے سے موجود نظام کے مقابلے میں بہتر یا موثر اور نہ ہی زیادہ 'جمہوری' ہیں۔

کیا ہم واقعی 'مزید جمہوریت' چاہتے ہیں؟

برینن (2016) اس خیال کے خلاف مزید قوی دلائل پیش کرتے ہیں کہ شمولیتی جمہوریت لازمی طور پر بہتر نتائج دے سکتی ہے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت کی یہ قسم در حقیقت بدتر نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ وہ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ووٹرز عوامی معاملات کے بارے میں حیران کن طور پر لاعلم ہوتے ہیں۔ برینن کے نزدیک یہ خیال کہ شرکت کسی نہ کسی طرح انہیں ماہر پالیسی سازوں میں تبدیل کر سکتی ہے انتہائی غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ غالباً انہیں کم از کم بنیادی معاملات رکھنے والا شوقیہ سیاسی بنانا

بھی ایک مشکل کام ہے۔ اور ایسی کسی کوشش پر وہ ناراضگی کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ ووٹرز کی ترجیحات جیسے کام، گھر، خاندان اور دیگر ذاتی مشاغل میں دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سیاست میں ان کی شمولیت ان کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ اس قسم (سیاسی) مشغولیت کے باعث وہ اپنا وقت ان مشاغل یا مصروفیات جن کی وہ قدر کرتے اور جن کی خواہش رکھتے ہیں، ان کی بجائے ایک ایسی سرگرمی میں گزاریں گے جس کی طرف ان کا سرے سے جھکاؤ ہی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم ہوتا ہے۔

اور ویسے بھی کیا سیاست کو ہماری زندگیوں میں اتنی اہمیت حاصل ہونی چاہیے؟ اور ضروری بھی نہیں کہ سیاست میں وسیع دلچسپی اور مشغولیت سے سماجی بیداری میں اضافہ اور اخلاقی اقدار مضبوط ہوتی ہیں۔ بلکہ درحقیقت یوں لوگوں کے بدعنوان و کرپٹ ہونے کا خدشہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سیاسی طاقت کا لالچ جتنا پرکشش ہوتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے دوسروں پر اپنے خیالات مسلط کرنے کی خواہش مضبوط ہوتی ہے۔ لبرل ڈیموکریسی کا اصل مقصد ہی ایسی کسی طاقت کو محدود کرنا اور اس طرح اقتدار میں رہنے والوں کو دوسروں کو ڈرانے دھمکانے اور ان کے استحصال سے روکنا ہے۔ لیکن جتنا زیادہ اجتماعی فیصلہ سازی کو 'شمولیتی جمہوریت' کے نام پر قانونی جواز دیا جائے گا اتنا ہی برسر اقتدار لوگوں کیلئے دوسرا کا استحصال آسان، اور اقلیتوں کے لیے اس کی مزاحمت مشکل تر ہوتی جائے گی۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں بہت سارے سیاسی کارکن 'زیادہ' یا 'گہری' جمہوریت کے خواہاں ہوتے ہیں؟ شاید وہ صحیح معنوں میں یہ یقین رکھتے ہوں کہ یہ سیاسی مساوات جیسی اہم اقدار کو فروغ دے گی، یا اس کے ساتھ زیادہ شفافیت آئے گی، یا اس سے اخلاقی اقدار مضبوط ہوں گی، اور یا یہ کہ اس کی مدد سے وہ سیاسی اشرافیہ سے اقتدار چھین لیں گے۔ لیکن شاید ان کے موقف یا ان وضاحتوں کے پیچھے اس قسم کے بے لوث محرک نہ ہوں۔ شاید وہ محض اجتماعی فیصلہ سازی کو قانونی حیثیت اور وسعت یہ سوچ کر دینا چاہتے ہوں کہ یہ طریقہ معاشرے کو چلانے کا فیصلہ افراد پر چھوڑنے سے بہتر ہے۔ شاید وہ یہ

تسلیم کرتے ہیں کہ ووٹرز اپنے منتخب نمائندوں سے زیادہ مداخلت پسند ہوتے ہیں۔ یا شاید ان کا یہ خیال ہو کہ زیادہ مداخلت پسند حکومت ان کے جیسے دانشوروں کو مزید ملازمتیں اور اعلیٰ حیثیت دے گی۔

محدود جمہوریت کا نظریہ یا تصور

اگر ووٹر واقعی غیر معقول، بے خبر، قبائلی اور مفاد پرست ہوتے ہیں تو پھر اصل سوال یہ نہیں ہے کہ انہیں کیسے بدلا جائے (جو کہ ناممکن دکھائی دیتا ہے) بلکہ ان کو دوسرے لوگوں پر کوئی اختیار کیوں دیا جائے یہ اہم سوال ہے۔ یہ دلیل زیادہ جمہوریت یا اس نظام کی توسیع کے حق میں نہیں بلکہ زیادہ محدود جمہوریت کے لیے دیا جاتا ہے: ایک ایسی حکومت جو ایسے فیصلے کرنے سے باز رہے جو ہم خود اپنے لیے کرسکتے ہیں اور اس کی بجائے خود کو اپنے کلیدی کردار۔۔۔ ہمارے حقوق، آزادیوں اور سلامتی کا تحفظ۔۔۔ تک محدود رکھے۔

جمہوریت کے حوالے سے لبرل سوچ یہ ہے کہ ہم نے اسے اپنے اوپر کنٹرول کیلئے نہیں بلکہ اپنے تحفظ کے لیے بنایا ہے۔ یہ اکثریت کو ہر فرد کی زندگی کے کثیر پہلوؤں پر حکمرانی کا اختیار دینے کا طریقہ ہر گز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو صرف ایسے نمائندوں کو منتخب کرنے کا ایک طریقہ ہے جو زیادہ باشعور، زیادہ پرجوش اور باہم مل کر وہ چند فیصلے کرنے کے زیادہ اہل ہوں جن کیلئے اتفاق رائے ضروری ہوتی ہے۔ ووٹرز کو ان کی مرضی اور آروؤں کے خلاف کچھ بنانے کی کوشش کرنے کی بجائے بہتر یہی ہوگا کہ ایسے ادارے بنائے جائیں جو ووٹرز کی عین مرضی اور آرزوؤں کی بنیاد پر جہاں تک ممکن ہو ایک بہترین حکومت کے قیام میں سہولت کاری کا کردار ادا کریں۔

جمہوریت اور سرحدیں

1989 میں دیوار برلن کے انہدام سے **آمرانہ** حکومت دفاعی پوزیشن پر آ گئیں۔ سوویت یونین کی تلخ حقیقت بے نقاب ہوئی، اور عمومی طور پر آمرانہ حکومتیں اپنی قانونی حیثیت کھونے لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا واحد متبادل کوئی ہے تو وہ جمہوریت ہی ہے۔ مشرقی یورپ، لاطینی امریکہ، افریقہ (خاص طور پر 1994 میں نسلی عصبیت کے خاتمے کے ساتھ)، جنوبی ایشیاء، جنوب مشرقی ایشیاء، حتیٰ کہ مختصر عرصہ کیلئے چین میں بھی، اصلاحی تحریکیں پھیلیں۔ یہی وجہ تھی کہ عالمی فہرستوں (انڈیکس) میں آزادی اور جموہریت کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ ممالک کو 'آزاد' کا لقب یا لیبل ملا۔

امریکی ماہر سیاسیات فرانسس فوکویاما نے تو 'تاریخ کا اختتام' تک کی بات کی۔۔(جنھوں نے اپنی کتاب ''دی اینڈ آف ہسٹری اینڈ دی لاسٹ مین (1992)'' میں یہ تصور پیش کیا) ایک ایسی دنیا جس میں ہر جگہ لبرل جمہوریت ظفریاب و کامیاب تھی۔ مغربی سیاست دانوں کو لگا کہ یہ ان کا فرض ہے کہ جمہوریت کو پوری دنیا میں پھیلا کر اس وژن کو عملی جامہ پہنائیں۔ اس کے لئے آمروں کو للکارا گیا۔ اور غیر ملکی امداد اور تجارتی معاہدے بدعنوانی کے خاتمے، اپنی حکومتوں میں اصلاحات اور جمہوری اداروں کو اپنانے سے مشروط کیے گئے۔

تاہم لبرل جمہوریت تخلیق یا دوبارہ پیدا کرنا یا بہ الفاظ دیگر اس کا قیام اور پھر اس کو دوام دینا اتنا آسان نہیں ہے۔ جیسا کہ امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس انتھونی کینیڈی (1999) نے نشاندہی کی: 'جمہوریت ایک ایسی چیز ہے جو آپ نسل در نسل ہی سیکھ سکتے ہیں۔ اسے سکھانا پڑتا ہے۔' اور یقیناً بعض پہلی جدید جمہوریتوں نے صدیاں تنازعات اور خونریزی میں گزار کر ہی اسے سیکھا ہے۔ آج جبکہ

جمہوریت کی بہت سی عملی مثالیں موجود ہیں تو ضروری ہے کہ نئی جمہوریتیں زیادہ تیزی اور پرامن طریقے سے قائم ہو سکیں۔

بہرحال رکاوٹیں پھر بھی ہیں۔ یہ ایک موثر طریقے سے کام کرے اور بارآور بھی ثابت ہو اس کے جمہوریت کو ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو اسے قبول کریں، اسے سمجھیں، اس کی قدر کریں اور اس کا احترام کریں۔ لیکن وہ لوگ جو ازل سے مطلق العنان حکومتوں کے تحت رہتے آرہے ہوں وہ اکثر جمہوریت سے خائف اور اس کے حوالے سے بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ بعض مواقعوں پر مصر کے حسنی مبارک جیسے آمر، اور دیگر مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقی ریاستوں میں اس کے ہم عصروں۔ کی جگہ نام نہاد 'جمہوری' حکومتوں نے لے لی جو (یہ حکومتیں) بعض حوالوں سے اور بھی کم لبرل ہیں کیونکہ جن انقلابیوں کو ووٹ کے زریعے منتخب کیا جاتا ہے انہیں کہیں نہ کہیں وہ اس مغالطے کا شکار ضرور ہو جاتے ہیں کہ ان کی اکثریت نے انہیں بے لگام طاقت عطا کر دی ہے۔ جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر، اگرچہ وہ اس کے اصولوں کو پامال کرتے رہتے ہیں، وہ قوام عالم کی توثیق کے متمنی یا پھر بین الاقوامی قانونی حیثیت کا دعویٰ کر لیتے ہیں جس کے وہ ہرگز مستحق یا حقدار نہیں ہوتے۔ دیگر مقامات پر آمروں، یوگوسلاویہ میں یوسیپ ٹیٹو، نے اپنے اپنے ملک میں قوم پرست، مذہبی یا نسلی گروہوں کے درمیان تنازعات کو دبانے میں کامیابی ضرور حاصل کی لیکن یہ کامیابی ان کے اقتدار تک ہی محدود رہی۔ اور جیسے ہی وہ منظر عام سے ہٹے یا ہٹائے گئے ان کے ملک شدید و تباہ کن جنگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ آمریت سے جمہوریت کی طرف منتقلی/سفر کے بارے میں لوگوں کا خوف بلا جواز نہیں ہے۔

مغرب کی غلطیاں

جمہوریت کوئی ایسا پودا نہیں کہ جسے نئی مٹی۔ جگہ میں لگا یہ امید باندھی جائے کہ یہ خود بخود پھل پھول

کر تناور درخت بن جائے گا۔ بلکہ اسے کاشت کرنے اور اس کی آبیاری کی ضرورت ہے۔ نہ ہی جمہوریت خود کار طریقے سے ان ممالک میں خوشحالی، حقوق، آزادی اور مساوات فراہم کر سکتی ہے جہاں یہ چیزیں نامعلوم اور اجنبی ہوں۔ افسوسناک طور پر مغربی سیاست دانوں کا خیال تھا کہ وہ یہ سب، اور اس سے آگے بھی کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے غلط طور پر یہ فرض کر لیا تھا کہ جمہوریت آزادی اور خوشحالی پیدا کرتی ہے (جبکہ حقیقت میں یہ لبرل اقدار ہیں جو یہ چیزیں پیدا کرتی ہیں)، انہوں نے بے جا طور پر یہ امید باندھ لی تھی کہ غریب ممالک ایک بار آمریت سے آزاد ہوئے تو بڑی بے تابی اور جوش و خروش سے اپنے لئے جمہوری ادارے کھڑے اور نظام قائم کریں گے۔

لیکن مغربی لوگ لبرل اور جمہوری اداروں کے ساتھ اتنا طویل عرصے تک رہے ہیں کہ انہیں اس کی اصل قدر اور اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انصاف، قانون کی حکمرانی، حقوق، امانت اور دیانت جیسی اقدار ہر جگہ موجود ہیں، یا پھر یہ کہ جبر و محکومیت کا خاتمہ ہوتے ساتھ ہی یہ اقدار فروغ پانا شروع ہو جائیں گی۔ وہ یہ بھی فرض کرتے ہیں کہ تمام ممالک کے لوگوں قومیت کا مشترکہ احساس پایا جاتا ہے، اور ہر جگہ ایک تعلیم یافتہ، لبرل متوسط طبقہ ہے جو جمہوری اصلاحات کو سمجھے گا اور انہیں آگے بڑھائے گا۔ لیکن ایسے ممالک جو صدیوں سے آمریت کے تحت زندگی گزارتے چلے آ رہے ہیں شاید وہاں یہ بنیادی عناصر سرے سے پائے ہی نہ جاتے ہوں نا ہی وہ اس طرح کے تصورات و خیالات کے بارے میں واضح شعور رکھتے ہوں۔

اس کی بجائے ایسے ممالک میں شاید نسلی طبقات یا دیگر سماجی گروہوں کے مابین دیرینہ و گہری رقابتیں پائی جاتی ہوں اور ان کے مابین باہم اعتماد کا فقدان ہو۔ شاید وہاں کے لوگوں کا یہ ماننا ہو کہ کوئی ملک مضبوط آمرانہ قیادت کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ وہ مستحکم جمہوریتوں کو شاید کمزور، بے اندازہ یا ضرورت سے زیادہ اور اندرونی طور پر منقسم نظام سمجھیں۔ اور غالباً استحکام کو آزادی پر، روایت کو خوشحالی پر، مذہب کو قانون کی حکمرانی پر فوقیت و اہمیت دینے میں ہی خوش رہیں۔

ریان مرفی (2018) نے یہ واضح کیا ہے کہ جب دیگر تمام عوامل کو مد نظر رکھا جائے تو آمریت در حقیقت بہتر و موثر حکمرانی کا باعث نہیں بنتی۔ لیکن دنیا کو جمہوریت کے ثمرات سے آگاہ کرنا بھی شاید اتنا آسان نہ ہو۔

ابھرتی ہوئی جمہوریتوں کے مسائل

در حقیقت بعض ممالک کچھ جمہوری چیزیں، جیسے انتخابات، پارلیمنٹ، عدالتیں، اپنا کر جمہوریت کا لبادہ اوڑھ بکر ھی شاید وہ جمہوریت کی اصل روح کی پیروی نہ کریں۔ ہوسکتا ہے وہاں قانون کی حکمرانی نہ ہو۔ وہاں کی عدالتوں میں بدعنوانی کا راج ہو۔ حقوق یا تو غیر محفوظ ہوں یا پھر چند لوگوں تک ہی محدود۔ مذہبی اصول فرد کی آزادی کو سلب کریں۔ جہاں انتخابات ایک دھوکہ ہوں جس میں امیدوار محدود/گنے چنے اور ووٹوں کی منصفانہ گنتی نہ ہو۔ پارلیمنٹ پر کوئی ایک جماعت غالب ہو، اور جہاں الیکشن جیتنے والے اپنے 'جمہوری مینڈیٹ' کو مخالفین کو ستانے کے لیے استعمال کرتے ہوں۔
اور ہوسکتا ہے کہ ان میں قومیت کا کوئی مشترکہ احساس ہی نہ ہو۔ بلکہ شاید ان میں نسلی، قبائلی، ثقافتی، نظریاتی یا مذہبی تنازعات کی بنیاد پر دیرپا تلخی اور انتشار پایا جاتا ہو۔ باہم دست و گریبان سیاسی جماعتیں ایک کمزور اور غیر فعال کا باعث بن سکتی ہیں۔ بعض اوقات وہی لوگ جو بااختیار اور محترم و عزتمند ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے مخالف جنگجو قائد ہوتے ہیں۔ ایسے میں لوگ فوجی طاقت کو شاید استحکام کا، اور یا حسب ضرورت اپنا مذہبی یا سیاسی نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کا واحد زریعہ و راستہ سمجھیں۔
اس لیے ایک مضبوط فوجی حکومت آزاد، جمہوری حکومت کے کسی بھی نظریہ سے شاید زیادہ مقبولیت حاصل کرے۔ درایں اثنا مذہبی اور سیاسی جنونی شاید اپنے مخالفین کو غلط اور ناقابل اصلاح، اور لبرل جمہوریت کو اس لئے اپنے اصولوں کے منافی سمجھیں کیونکہ اس میں متبادل طرز زندگی کو گوارا کیا جاتا ہے۔ جہاں ایسے غیرت مند اپنے وژن کو آگے بڑھانے کے لیے دہشت گردی یا فوجی طاقت کا استعمال

کرنے پر آمادہ ہوں وہاں ابھرتی ہوئی جمہوریت کے نوزائیدہ اداروں کے پیروں تلے روندنے میں دیر نہیں لگ سکتی۔

جمہوری اقدار کو مسلط کرنے کی ناکام کوشش

اگرچہ اس طرح کے مسائل سے دوچار علاقوں میں لبرل جمہوریت کے قیام کے امکانات امید افزا نہیں ہوتے لیکن بہت سی مغربی حکومتیں اس کے باوجود ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ جمہوریت ہی بہترین حل ہے۔ ان کو یہ بھی یقین ہے کہ جمہوریت امن، آزادی اور خوشحالی کو فروغ دیتی ہے۔ وہ شاید یہی چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی ان فوائد سے لطف اندوز ہوں۔ وہ شاید آزاد انتخابات اور عالمی (یکساں) حق رائے دہی جیسے جمہوری اداروں کو سماجی اور سیاسی اصلاحات آگے بڑھانے کا طریقہ سمجھتے ہیں۔ وہ شاید انسانی وقار اور سیاسی مساوات جیسے اہم اصولوں کے اظہار کیلئے خود جمہوریت کو ایک آئیڈیل بھی تصور کرتے ہیں۔

اس کے باوجود دوسرے ممالک کو جمہوریت بر آمد کرنے کی ان کی کوششوں کو محدود کامیابی ہی ملی ہے اور اکثر ان کی یہ کوششیں ناکافی اور غیر موثر ہی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر 2003 کے بعد کی عراق جنگ ایک مطلق العنان آمریت کو ہٹانے کے محدود مقصد کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس کے پیچھے تب شاید یہ ایک مفروضہ کارفرما تھا کہ ایک بار یہ آمریت ہٹ جائے تو اس کے بعد لبرل جمہوریت کے نظریات، اصول اور ادارے کسی نہ کسی طرح زندہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ثابت ہوئی۔ اور افسوسناک طور پر حکومت کے وفاداروں کو منظم طریقے سے ہٹانے سے اہم ادارے (پولیس، عدالتوں، سول انتظامیہ) قیادت سے محروم ہو گئے، افراتفری پیدا ہوئی، اعتماد تباہ ہوا اور جمہوری اصلاحات متعارف کروانا مزید مشکل کام بن گیا۔

بین الاقوامی ادارے

کیا اقوام متحدہ جیسے بین الاقوامی ادارے دنیا کو جمہوریت کی طرف لے جانے کے لیے بہتر کام کر سکتے ہیں؟ بہت سی وجوہات اس خیال کو مشکوک بناتی ہیں۔

اول تو ورلڈ بینک یا بین الاقوامی مالیاتی فنڈ جیسے عالمی اداروں کو اکثر نو آبادیاتی تصور کیا جاتا ہے یعنی جو اپنی دولت کے بل بوتے پر حکومت کے اپنے مخصوص تصور کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ شاید ان قوموں کو مالی امداد دینے سے انکار کریں جو شفاف طرز حکمرانی کے ان کے وژن سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

دوسری یہ کہ بہت سے بین الاقوامی ادارے بڑی یا مستحکم عالمی طاقتوں کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر چین، فرانس، روس، برطانیہ اور امریکہ اقوام متحدہ کی کسی بھی ٹھوس قرارداد کے حوالے سے حقِ استرداد (ویٹو پاور) رکھتے ہیں؛ اگرچہ جاپان، جرمنی اور ہندوستان سب اقتصادی طور پر برطانیہ اور فرانس سے بڑے ہیں لیکن انہیں ایسا اختیار نہیں حاصل۔

تیسری یہ کہ بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ کیا اقوام متحدہ کبھی لبرل جمہوریت کے لیے ایسی صورت میں قابل اعتبار قوت ثابت ہو سکتی ہے جب اس کی اپنی ہیومن رائٹس کونسل میں کانگو اور اریٹیریا جیسی قومیں شامل ہوں جن کی آزادی کے بین الاقوامی اشاریہ پر اپنی کارکردگی بہت بری ہے۔

چوتھی یہ ہے کہ بین الاقوامی ادارے حکومتوں کی نمائندگی کرتے ہیں عوام کی نہیں۔ اکثر ان حکومتوں کو ان کی اپنی آبادی، یا اس کے ایک خاطر خواہ حصے کی طرف سے ناپسندیدگی اور نفرت کا سامنا ہوتا ہے۔ پھر بھی ان کے مندوبین پورے ملک کی طرف سے بات کرنے کا یا ان کا نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس طرح کی ساخت رکھنے والی تنظیموں پر شاید یہ اعتماد یا اعتبار کرنا ممکن نہ ہو کہ یہ جمہوری اصلاحات کو آگے لے کر جائیں گی یا ان کو فروغ دیں گی۔

عالمی جمہوریت؟

کم از کم ایک صدی تک مثالیت پسند (آئیڈ یلسٹ) ایک عالمی جمہوری حکومت کے قیام کا خواب دیکھتے رہے۔ اس خیال سے بھی کئی شدید مسائل جڑے ہوئے ہیں۔

اول یہ جمہوریت شاید ہی عالمی سطح پر قابل عمل ہو۔ آخر سات اعشاریہ آٹھ ارب کی آبادی عالمی انتخابی عمل میں کیسے حصہ لے سکتی ہے؟ ہم ایک ایسی عالمی حکومت کیسے تشکیل دے سکتے ہیں جو منصفانہ طور پر ہر کسی کی نمائندگی کرتی ہو وہ بھی اس خدشہ کے بغیر کہ بڑی اقتصادی طاقتیں یا بڑی آبادیاں اس کا کنٹرول حاصل نہیں کریں گی؟ اور دنیا کی سوچ، ثقافت، تاریخ، تجارتی روابط، وابستگیوں اور نقطہ ہائے نظر میں فرق کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی کیسے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ "دنیا" کی نمائندگی کر رہا ہے؟
قومی حدود سے باہر اختیار یا حکومت (سپر نیشنل) کے قیام کی معمولی کوششیں بھی مشکل ثابت ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر یورپی یونین کی پارلیمنٹ میں تقریباً تیس ممالک کی نمائندگی موجود ہے۔ اگرچہ اسے عوام منتخب کرتے ہیں لیکن اس میں شامل بہت سی قوموں اور پارٹیوں، اور بہت سے مختلف قومی مفادات کے باعث اس کا اختیار یا طاقت و اثر رسوخ بہت محدود ہے۔ حقیقی فیصلے قومی حکومتوں کے نمائندوں پر مشتمل غیر منتخب ادارے کرتے ہیں۔ ناقدین 'جمہوری خسارے' کی شکایت کرتے ہیں لیکن یہ تصور پیش کرنا بھی مشکل ہے کہ جمہوریت کو کیونکر قومی ریاستوں سے آگے کام کرنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ابھرتا ہے کہ یہ ادارے جتنے بڑے ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی انہیں شفاف اور ان کے سامنے جوابدہ بنانا مشکل ہوتا جاتا ہے جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ عالمی حکومت کے تناظر میں حکومت اور عوام کے درمیان فاصلہ (عملاً اور مجازاً دونوں)، نیز زبانوں اور بین الاقوامی نقطہ ہائے نظر کا متضاد تنوع، حقیقی نمائندگی، نگرانی یا یہاں تک کہ بات چیت کو ممکن بنانا عملاً ناممکن ہو جاتا ہے۔ انتخاب کرنے والے یا ووٹرز اپنی قومی حکومتوں کے مقابلے میں ایسے اداروں سے اور بھی زیادہ الگ

تھلگ اور جدا ہوں گے یعنی خود کو ان کا حصہ محسوس نہیں کریں گے۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ ممالک کے قانونی نظام مختلف ہوتے ہیں۔ صدیوں میں پروان چڑھنے والے ان نظاموں کی جڑیں گہری ہوتی ہیں جو مختلف تاریخی، ثقافتی، لسانی اور سماجی ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی بنیاد مختلف مفروضوں پر رکھی گئی اور یہ مختلف اصولوں کے تحت کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قانون اور انصاف کے حوالے سے ان کے واضح نظریات بھی مختلف، اور مخالف یا متضاد بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دیوانے کا خواب ہی ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے اختلافات کو نظرانداز اور اس طرح کے متنوع نظاموں کو ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جمہوریت صرف قانون کی حکمرانی کی متفقہ بنیاد پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔

چھوٹے گروہوں کے لیے ایک نظام؟

جمہوریت چھوٹے گروہوں میں سب سے زیادہ آسانی سے کام کرتی ہے۔ چھوٹے ممالک میں مشترکہ اقدار، باہمی تعلقات کے مضبوط نیٹ ورک، باہمی تعلق کا احساس، اور زیادہ اعتماد کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بڑے معاشروں میں جہاں مختلف اقدار کے حامل بہت سے مختلف گروہ رہتے ہوں، اور جہاں لوگ ایک دوسرے کو اتنے قریب سے نہ جانتے ہوں، وہاں باہمی اعتماد کیلئے سازگار ماحول بنانا اور بھی زیادہ مشکل کام ہو سکتا ہے۔

تاہم اس کے باوجود بڑے معاشروں میں بھی باہمی اعتماد کا حصول، اور اس کی بنیاد پر جمہوریتوں کا قیام بھی، ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ مگر، جیسا کہ ونسنٹ آسٹروم (1997) نے وضاحت کی ہے، یہ عمل مشکل و پیچیدہ اور اس میں ٹھیک ٹھاک وقت لگ سکتا ہے۔ اس امر کو یقینی بنانے کیلئے کہ جمہوری ادارے ٹھیک طرح سے کام کر سکیں، خصوصی انتظامات کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر واضح و شدید اختلافات، جیسے کہ مختلف نسلوں یا زبانوں کا امتزاج، کے حامل ممالک ایسے وفاقی نظام تیار کر سکتے

ہیں جو مرکزی سطح پر کئے جانے والے فیصلوں کی ایک حد مقرر کر سکتے ہیں (مطلب کیا کیا فیصلے مرکز/وفاق کر سکتا ہے): سوئٹزرلینڈ اور کینیڈا اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ایک قابل غور امر یہ بھی ہے کہ زمینی رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑے جمہوری ممالک (مثال کے طور پر کینیڈا، امریکہ، آسٹریلیا اور ہندوستان) میں وفاقی نظام ہی رائج ہے۔

مزید برآں، دنیا بھر میں ایسے ممالک کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جنہوں نے انتہائی غیر یقینی اور ناساز گار ماحول میں جمہوری حکومتیں قائم کی ہیں۔ اور جہاں تک جمہوریت کے فوائد یا ثمرات کے متمنی دیگر لوگوں کا تعلق ہے تو ان کے پاس اسے نقل کرنے اور اپنے حالات کے مطابق ڈھالنے کیلئے کئی راستے، کئی آپشن ہو سکتے ہیں۔ ایسا کرنا شاید آسان نہ ہو لیکن (سیاستدانوں کے بارے میں ان کی تمام تر شکایات کے پیش نظر) نسبتاً نسبتاً لبرل جمہوریتوں میں رہنے والے زیادہ تر لوگ اب بھی یہ دلیل دیں گے کہ یقینی طور پر یہ اس قابل ہے کہ اس کیلئے کوشش کی جائے۔

تجربے کے اسباق

کیا ہم واقعی جمہوریت چاہتے ہیں؟

کینیڈا کے ماہر سیاسیات سی بی میک فیئرسن نے لکھا: "جمہوریت ایک برا لفظ ہوتا تھا۔ ہر کوئی یہ جانتا تھا کہ جمہوریت اپنے اصل معنوں۔۔ 'اکثریت کی مرضی کے مطابق عوام کی حکمرانی یا حکومت'۔۔ میں ایک بری چیز ہو گی۔۔ شخصی آزادی کے لیے مہلک۔۔ (لیکن) پھر، پچاس سال کے اندر اندر جمہوریت ایک اچھی چیز بن گئی۔"

جمہوریت شاید ایک مقبول و ہر دلعزیز نظریہ ہی ہو لیکن عام خیال کے برعکس اسے سمجھنا اور اس پر عمل کرنا زیادہ پیچیدہ اور مشکل کام ہوتا ہے۔ اس کا انحصار ایک ایسے کلچر پر ہوتا ہے جس میں انفرادی حقوق، قانون کی حکمرانی، رواداری کا احترام، اور قابل اعتماد ادارے ہوتے ہیں۔۔ اس کلچر کو پروان چڑھنے میں کافی وقت لگ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری ثقافتوں یا معاشروں میں جمہوریت متعارف کرانے کی کوششیں (جیسے شمالی افریقہ، مشرق وسطیٰ اور ایشیاء میں آمریت کے بعد کی حکومتیں) اکثر تباہی پر اور ایک مختلف قسم کی جابرانہ حکومت۔۔۔ اکثریت کی، نظریات کی، یا مذہبی تقلید پسندی کی۔۔ پر منتج ہوئیں۔

لوگ جمہوریت کو 'عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے' کی کچھ مثالی شکل کے طور پر تصور کرتے ہیں جیسا کہ امریکی صدر ابراہم لنکن (1863) نے اپنے گیٹسبرگ خطاب میں کہا تھا۔ لیکن

جدید جمہوریت ایسی کسی چیز کا بھی نام نہیں ہے: اس میں عوام محض اپنے نمائندوں کو منتخب کرتے ہیں جو پھر (عوم کی جگہ) فیصلے کرتے ہیں۔ اگر آپ شکست خوردہ سائیڈ پر ہیں تو یہ شاید ہی آپ کے لیے 'حکومت' ہو۔ اور اصل میں 'عوام' ہیں کون؟ خواتین کو ووٹ کا حق حاصل کرنے میں صدیاں لگیں۔ اور کچھ ممالک میں مختلف نسلی 'لوگوں' میں گہری تقسیم پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں ایک وسیع تر فلسفیانہ سوال یہ بھی ہے کہ خواہ جو بھی صورت ہو ایک اکثریت کی اقلیت پر 'حکومت' کرنے کا کیا قانونی و اخلاقی جواز بنتا ہے۔

جمہوریت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ سیاسی مساوات اور شمولیت، انصاف، احتساب اور سماجی مشغولیت (انگیجمنٹ) جیسی مفید اقدار کو فروغ دے سکے۔ انگریزی ناول نگار ای ایم فوسٹر (1951) نے "دو وجوہات کی بنا پر جمہوریت کو داد" دی: "ایک اس لیے کہ یہ تنوع کو تسلیم یا برداشت کرتی ہے اور دوئم اس لیے کہ یہ تنقید کی اجازت دیتی ہے۔" لیکن اگر جمہوریت اپنے آپ میں اچھی بھی ہے تو بھی یہ کافی نہیں ہے۔ اس کے اچھے نتائج بھی ضروری ہیں۔ ہم جمہوریت کو صرف اسی صورت میں جائز قرار دے سکتے ہیں جب یہ کام کرے یعنی نتیجہ خیز ہو۔

جمہوریت کا جواز کیا ہے؟

جیسا کہ 20ویں صدی میں آسٹریا کے سیاسی ماہر معاشیات جوزف شُمپِٹر (1942) نے اس اہم مشاہدے کو اجگر کیا تھا (کہ) قرون وسطیٰ میں شاید عوام نے چڑیلوں کو جلانے کے حق میں بھی ووٹ دیا ہو گا۔ اور آج بھی ایسی جگہیں ہیں جہاں اکثریت یہ مانتی ہے کہ ایسی اقلیتوں پر جن کے بارے مین ان کے تحفظات ہوتے ہیں (مطلب اچھے نہیں لگتے)، ان پر ظلم کرنا بالکل قابل قبول (رویہ) ہے۔

لیکن ہمیں یہ بالکل بھی فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ اکثریت کو دوسروں پر حکمرانی کرنے کا ناقابل تردید اور واضح اختیار حاصل ہے، یا یہ کہ اکثریت کے فیصلے لازمی طور پر 'صحیح/درست' اور 'منصفانہ' ہوتے

ہیں۔ مختلف تجربات سے سبق لیتے ہوئے آج کی زیادہ تعلیم یافتہ، روشن خیال اور لبرل آبادیاں یا معاشرے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اکثریت کی حکمرانی انسانیت کا حتمی اصول یا قدر نہیں ہے (بلکہ برداشت اور دوسروں کی زندگیوں کے احترام جیسے تصورات اس سے بالاتر ہوتے ہیں۔

لیکن اگر جمہوریت کا مقصد اکثریت کو بے لگام طاقت دینا نہیں ہے تو ہم کس طرح یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا یہ کام کر رہی ہے؟ بہت سے معیارات یا پیمانے ہو سکتے ہیں: مثال کے طور پر آیا یہ تنازعات کو واقعی کم کرتی اور طاقت کی پرامن منتقلی کو یقینی بناتی ہے، یا اس کے زریعے سامنے آنے والے فیصلے درحقیقت ترقی پسندانہ، بامقصد اور موثر ہوتے ہیں۔

ایک پائیدار جمہوریت کیسی ہو گی؟

جمہوریت کی ترقی اور پائیداری کیلئے ضروری ہے کہ یہ اپنے بنیادی مقاصد پر توجہ مرکوز رکھے، لبرل نقطہ نظر سے یہ مقاصد کچھ اور نہیں بلکہ افراد کے حقوق کا تحفظ، جبر و زبردستی کو کم سے کم کرنا، اور صرف ان معاملات (اور صرف وہی چند امور یا معاملات) تک خود کو محدود رکھنا جن کا فیصلہ اجتماعی طور پر کرنا ضروری ہے۔ اسے حقوق کو لازماً سب پر مقدم رکھناہ اور انہی حقوق کو افراد پر دوسروں یا ریاست کی جانب سے جبر کے خلاف ناگزیر ڈھال کے طور پر تسلیم کرنا ہو گا۔ ان خصوصیات کے بغیر شاید ہی کوئی جمہوریت زیادہ دیر تک قائم رہ سکے۔

جمہوریتوں کی پوری تاریخ ہنگامہ آرائی اور فساد سے عبارت رہی ہے ۔۔۔ اور عام طور پر ان کی عمر اتنی ہی مختصر رہی ہے جتنی کہ وہ اپنی موت میں پر تشدد رہی ہیں۔ جیمز میڈیسن (1787)، 'فیڈرلسٹ نمبر '10

بہرحال کچھ اداروں کا ایک بنیادی مجموعہ ہے جو جمہوریت کو معقول حد تک لمبی زندگی دینے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اکثریت اور اس کے نمائندوں کی طاقت پر روک کے لیے لازمی قوانین

ہونے چاہئیں۔ آزادانہ، منصفانہ اور مسابقتی انتخابات کا انعقاد ضروری ہے جو کہ ووٹرز کو حقیقی متبادل پیش کریں۔ شہری آزادیوں کا تحفظ، ایک آزاد پریس، آزادی اظہار اور حکام کی طرف سے کسی قسم خوف یا ڈر کے بغیر آزاد انجمن یا اسمبلی کا ہونا ضروری ہے۔ ایسی طاقت فوجی، بادشاہت یا مذہبی عقائد کے پاس نہیں ہونی چاہیے جو عوام اور قانون سازوں کے فیصلوں کی جگہ لے سکے یا انہیں زیر کرے، پاؤں تلے روند ڈالے۔

دورِ حاضر میں مکمل بالغ رائے دہی کو ناگزیر، اور جدید جمہوریت کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے اور اس کے بغیر جمہوریت کا تصور ممکن نہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ووٹر بعض اوقات تباہ کن یا برے فیصلے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1932 میں انہوں نے نازیوں کو جرمنی کی 'رائیک سٹاگ' (جرمن پارلیمان) میں سب سے بڑی پارٹی بنا دیا۔ یہ تو ایک طرف سب سے زیادہ آزاد خیال اور ترقی پسند ممالک میں بھی ضروری نہیں کہ ووٹرز ہمیشہ اسی چیز کو ووٹ دیں گے جو ان کے خیال میں ملک کے لیے بہتر ہے بلکہ وہ اس چیز کو ووٹ دیتے ہیں جو ان کے خیال میں ان کے لیے بہتر ہوتی ہے۔ بہت سے ووٹر روزی روٹی کے لئے بھی ریاست پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو لامحالہ ان کے انتخابی فیصلے کو متاثر کرتی ہے۔ کچھ رائے دہندگان سمجھداری سے فیصلہ کرنے کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ جیسن برینن (2016) اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں، ہم نا اہل فقہا کو کسی کی آزادی کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، تو پھر نا اہل ووٹروں کو ہر ایک کی آزادی لینے کی اجازت کیوں دی جائے؟ لیکن پھر انتخاب کرنے والوں کی اہلیت کو طے کرنے کا کوئی آفاقی اور غیر متنازعہ طریقہ بھی نہیں ہے: ہم یہ امید ہی کر سکتے ہیں کہ جمہوریت اتنی مضبوط ہو کہ وہ ان کی غلطیوں کو برداشت کر سکے۔

امریکہ کے دوسرے صدر جان ایڈمز (1814) نے لکھا، "کوئی جمہوریت ایسی نہیں رہی جس نے خودکشی نہ کی ہو۔" اس کے باوجود جمہوریت، خلافِ قیاس، تب سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے جب لوگ اسے چھوڑنے، وہاں سے جانے کے لیے آزاد ہوں۔ علیحدگی یا چھوڑ کر جانے کا یہ عمل حکام کیلئے

محض ووٹ ڈالنے سے کہیں زیادہ طاقتور پیغام ہے۔ جیسا کہ جیمی لیمکے (2016) نے کہا اگر حکومت لوگوں کے فائدے کے لیے کام کر رہی ہے، تو زیادہ امکان ہے کہ وہ ٹھہرنا، رکنا پسند کریں گے۔ اس کے برعکس اگر ان میں عدم اطمینان پایا جاتا ہو اور وہ چھوڑ کر جانا چاہیں تو چیزوں کی اصلاح کے لیے دباؤ مزید بڑھ جاتا ہے۔ وفاقی نظام سب سے آسان فرار/نکلنے کی آسان ترین راہ فراہم کر سکتے ہیں کہ افراد ایسے مختلف یا مفرد نظاموں کے تحت چلائے جانے والے صوبوں میں ایک سے دوسرے میں بغیر کسی دقت کے منتقل ہو سکتے ہیں۔ لیکن آج بین الاقوامی نقل مکانی ایک ایسا آپشن ہے جو مسلسل مضبوط ہوتا جارہا ہے۔

متبادل جمہوری نظام

جمہوریت میں مسائل ضرور ہو سکتے ہیں لیکن 'زیادہ' جمہوریت سے وہ خود بخود حل نہیں ہو جاتے۔ ریفرنڈم اور 'بیلٹ انیشیئیٹو' کے زریعے قوانین پر براہ راست ووٹنگ پاپولسٹ (مقبول) اور متضاد نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ اسی طرح غور و فکر والے نظام اور آن لائن ووٹنگ نادانستہ طور پر صرف ان خامیوں کو تقویت دے سکتے ہیں جو پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ عملی مسائل بھی ہیں۔ عام لوگوں کے پاس پالیسی کو سوچنے سمجھنے کے لیے وقت اور دلچسپی نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ پالیسی سازی کے عمل پر وہ لوگ حاوی ہو سکتے ہیں جو اس میں دلچسپی تو لیتے ہیں لیکن وہ عوام کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اور نام نہاد ''شمولیتی'' طریقے اپنا کر اکثریتی فیصلہ سازی کو زیادہ جائز بنانے سے اقلیتوں کو مزید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کتنی اجتماعی فیصلہ سازی کی ہمیں ضرورت ہے؟ معاشروں میں اجتماعی فیصلوں یا اوپر سے احکامات کے بغیر خود کو منظم کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہوتی ہے۔ جیسا کہ آسٹریا کے ماہر اقتصادیات ایف اے ہائیک (1988) نے کہا، 'بے ساختہ ترتیب ہمارے ارد گرد

موجود ہے: بازاروں میں، زبان کی نشوونما جس طریقے سے ہوتی ہے اس میں، ویکیپیڈیا جیسے آن لائن اداروں میں اور سب سے بڑھ کر عام قانون میں جو قدرتی طور پر افراد کے درمیان بات چیت کے ذریعے بڑھتا یا ترقی پاتا ہے۔ اس کیلئے صرف عمل اور اخلاقیات کے چند آسان اصولوں کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ 'لوگوں کو تکلیف نہ پہنچائیں اور ان کی چیزیں نہ لیں'، امریکی سیاسی کارکن میٹ کبی (2014) نے اسے اسی عنوان کی ایک کتاب میں ان سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اسی اخلاقی بنیاد پر لوگ، سول سوسائٹی کی تنظیموں سے لے کر حقیقتاً چھوٹی سرکاری اکائیوں کے قیام تک، اپنی کمیونٹیز قائم کر سکتے ہیں۔ بہت سی مختلف انتظامی اکائیوں کی موجودگی لوگوں کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ اگر وہ (کسی ایک اکائی یا نظام میں) محسوس کریں کہ انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے یا ان کا استحصال کیا جا رہا ہے تو وہ اس سے بچنے کی راہ نکال سکتے ہیں، وہاں سے نکل یا فرار ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ایسا کرنا 'عالمی حکومت' کے تحت ناممکن ہو گا۔ مزید بر آں، بے ساختہ معاشروں کو چلانے والے قواعد چھوٹے گروپوں میں ممکنہ طور پر زیادہ آسان اور زیادہ متفقہ ہوں گے۔ جمہوریت انسانی اداروں کا ایک مجموعہ ہے جس کی بنیاد اتفاق رائے پر ہوتی ہے اور جس کا مقصد کسی معاہدے تک/نتیجے پر پہنچنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے انسانی رابطے کی ضرورت ہے: کہ جمہوریت تب ہی موثر ہوتی ہے جب اس کیلئے صرف خیال تصورات ہی نہیں بلکہ عملی اقدامات کئے جائیں۔

ایک بار پھر، ٹیکنالوجی بجائے اس کے کہ دوسرے ہمارے لئے منصوبہ بندی کرے پھریں ہمیں اپنی زندگیوں پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول فراہم کرتی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی (آئی ٹی) چھوٹے گروپوں یا برادریوں شناخت اور باہمی مفاد کی بنیاد پر اکٹھا ہونے کے قابل بناتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ہمیں کسی بڑی حکومت یا اس کی وسیع پیمانے پر مداخلت کی ضرورت ہے؟ ریاستی خدمات اور بیمہ (سوشل انشورنش) میں جدت اور آسانی لائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح تجارت و کاروبار کو بھی آزاد کیا جا سکتا ہے کیونکہ آئے روز فرد سے فرد کے درمیان آن لائن تجارتی نظام یا پلیٹ فارمز ابھرتے رہتے

ہیں۔

بلاشبہ یہ دلیل کہ لوگ خود حکومت نہیں کر سکتے (جو کبھی عورتوں اور غلاموں کو ووٹ کا حق دینے سے بھی انکار کرتے تھے) تیزی سے کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے ہے۔ لوگ اختراعی ہوتے ہیں۔ آج وہ ہر ایک کے لیے اجتماعی فیصلہ سازی کی ضرورت کے بغیر خود کو منظم، اور اپنے لئے ٹیکسی، چھٹیوں کی رہائش، ڈیلیوری، یوٹیلیٹیز اور بہت کچھ کا، مؤثر ور جدید ترین طریقوں سے آن لائن بندوبست کر سکتے ہیں۔

جمہوریت سب کچھ نہیں ہے

جمہوریت کے پر جوش حامی اکثر دونوں حوالوں سے– دوسرے ممالک یا اقوام تک اس کے پھیلاؤ یا داخلی طور پر اجتماعی فیصلہ سازی میں مزید وسعت۔۔۔ اس میں مزید توسیع چاہتے ہیں۔ تاہم اس کے بجائے ان کے لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ صرف اکثریت کی فیصلہ سازی پر مکمل انحصار کے اس رجحان میں خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ اور یہ کہ 'عوام' کے فیصلے (اس سے قطع نظر کہ انہیں کس طرح واضح کیا گیا ہے) ضروری نہیں کہ بذات خود درست بھی ہوں اور جائز بھی جیسا کہ چڑیلوں کو زندہ جلانے کی تاریخی مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جمہوریت ایک اچھی حکومت کا قانون کی حکمرانی، انفرادی حقوق، رواداری، آزادی اظہار اور دیگر بہت سے عوامل کے علاوہ صرف ایک عنصر ہے۔ جمہوریت ایک موثر طریقے سے کام کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دائرہ کار اس کے ضروری کاموں تک محدود رکھا جائے، اور ایک محفوظ و سازگار ماحول فراہم کیا جائے جہاں افراد اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کر سکیں۔ اور لوگوں کے خلاف طاقت اور اختیار کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے اس (جمہوریت) کی حدود کا تعین ہونا چاہیے۔ بعض فیصلوں کے لیے کچھ آئینی پابندیوں، اختیارات کے توازن اور ایک واضح اکثریتوں کی

ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تاہم ایک حقیقی لبرل جمہوریت کیلئے ایک گہری ثقافت/کلچر اور تفہیم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

جمہوریت کے (کچھ) تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر انسانی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کیلئے خود پر ضبط، خصوصاً اکثریت میں یا صاحبان اقتدار و اختیار کو کنٹرول، کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تقاضا کرتی ہے کہ ہم ذاتی فائدے اور فوری اطمینان پر کسی ایسی چیز کو ترجیح دیں جو طویل المدتی ہوتی ہے۔ یہ اس امر کی بھی متقاضی ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کو قبول کریں اور پوری رضامندی اور ایمانداری سے ان سے سیکھیں۔ جمہوریت ہر جگہ یکساں طور پر رائج کرنے کی چیز نہیں بلکہ اسے جو بھی تاریخی اور ثقافتی ماحول ہے اس کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہر طرح کے اصولوں، غالب عالمی نظریہ جس کے تحت یہ کام کرتی ہے اور چھوٹے قواعد یا روایات (تقریباً 'آداب/اخلاق' کی طرح) جن کے تحت یہ اچھی طرح سے کام کرتی ہے دونوں، کی عام قبولیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک کھلے معاشرے کی ضرورت ہے — ایک ایسا معاشرہ جو قابل انتظام ہو (نہ زیادہ بڑا ہو نہ زیادہ چھوٹا)، لیکن جو دنیا بھر کے دیگر کھلے معاشروں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے تیار و آمادہ بھی ہو۔ جہاں تک ہمارے سیاستدانوں کا تعلق ہے تو ان کو چاہیے کہ خود شہریوں کو منظم کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے شہریوں کی خود ساختہ تنظیم کو فروغ دیں، مطلب شہری خود کو منظم کرنا چاہیں تو سیاستدان اس میں سہولت کاری کا کردار ادا کریں۔ اور سیاسی مداخلت کو کم سے کم کرنے کا بھی ایک معاملہ یا یوں سمجھ لیں کہ مقدمہ ہے: معاشرہ اتنا پیچیدہ ہے کہ کسی بھی مرکزی حکومت یا اتھارٹی کے لیے یہ آسان نہیں کہ اس کیلئے منصوبہ بندی کرے، اس کا انتظام سنبھالے یا یہاں تک کہ اس کو سمجھ پائے۔

ذاتی یا شخصی آزادی کو کسی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی: آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کا خمیازہ آپ ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ تاہم، جمہوریت کو جواز کی ضرورت اس لئے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں آپ جو کچھ

کرتے ہیں اس کا خمیازہ دوسروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

کیا ہمیں جمہوریت کو جائز قرار دینا چاہیے؟ یہ تجربہ تاحال جاری ہے۔ دیگر نظاموں کے مقابلے میں جمہوریت کا تعلق انفرادی/شخصی اور انسانی حقوق کے احترام، اور باہر جا کر خوشحال و فارغ البال ہونے کی آزادی جیسی لبرل اقدار سے ہے۔ یہ ایک بار قائم و مستحکم ہو جائے تو حیرت انگیز طور پر مستحکم اور پائیدار ثابت ہوتی ہے۔ اور جمہوری ادارے، چاہے نامکمل ہی کیوں نہ ہوں، ایک ایسا فورم مہیا کرتے ہیں جہاں لبرل اقدار کی حمایت کرنے والے اپنے مقدمے پر بحث کر سکتے ہیں اور حقیقی لبرل جمہوریت کے عملی اور اخلاقی فوائد کو وضاحت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔

جمہوریت کے بارے میں اقوال

اکثریت کا ظلم

لامحدود جمہوریت، بالکل امر شاہی یا اشرافیہ کی حکومت کی طرح، لوگوں کی ایک بڑی تعداد پر پھیلا ہوا ظلم ہے۔ ارسطو (350 قبل مسیح)، 'پالیٹیکس'

جمہوریت آزادی کا نام نہیں ہے۔ جمہوریت دو بھیڑیوں اور ایک میمنے کے مابین اس بات پر ووٹنگ ہے کہ دوپہر کے کھانے میں کیا کھایا جائے۔ آزادی بعض حقوق کی پہچان سے حاصل ہوتی ہے جو 99 فیصد ووٹ لے کر بھی شاید حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

مارون سِمکِن (1992)، 'انڈیوژوول رائٹس'، لاس اینجلس ٹائمز

طاقت بدعنوان (کرپٹ) بناتی ہے

جیسے ہی لوگوں کے پاس اقتدار آتا ہے وہ بدعنوان (بے ایمان) ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات گھٹیا یا خبطی بھی، کیونکہ اقتدار پر قبضہ انہیں ایک ایسی (حالت) میں لے جاتا ہے جہاں عام ایمانداری سے کبھی بات نہیں بنتی (یعنی کوئی فائدہ اس کا نہیں ہوتا)۔ ای ایم فورسٹر (1951)، 'ٹو چیئرز فار ڈیموکریسی'

تمام حکومتیں بار بار آنے والے مسئلے کا شکار ہوتی ہیں: طاقت مرضیاتی (پیتھولوجیکل۔۔ انتہائی اور ناقابل قبول طرز عمل والے، جو اپنے جذبات پر قابو نہیں پاتے) شخصیات کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ایسا نہیں کہ طاقت کرپٹ ہوتی ہے بلکہ یہ کہ یہ کرپٹ لوگوں کے لیے مقناطیسی کشش کی حامل ہوتی ہے۔

فرینک ہربرٹ (1965)، "ڈیون"

میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ حکمران شاذ و نادر ہی اوسط سے اوپر رہے ہوں گے، یا تو اخلاقی لحاظ سے یا فکری طور پر، بلکہ وہ اکثر اوسط سے نیچے ہوتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سیاست میں، بدترین (صورتحال) کے لیے تیاری کے اصول کو اپنانا مناسب ہے۔ کارل پوپر (1945)، 'دی اوپن سوسائٹی اینڈ اِٹس اینیمیز'

جمہوریت کا کلچر

اگر آزادی اور مساوات جیسا کہ کچھ لوگوں کے خیال میں جمہوریت میں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں تو، وہ سب سے بہتر اس وقت حاصل ہوں گی جب تمام افراد حکومت میں یکساں طور پر شریک ہوں۔ ارسطو (350 قبل مسیح)، 'پالیٹکس'

فرد کو ریاست پر قربان کر کے رومی دنیا کے حکمرانوں نے ان حقیقی خوبیوں کو مجروح کر دیا جو اسے برقرار رکھتی تھیں۔ انہوں نے فعال اور خوددار شہریوں کو غیر فعال اور خودغرض شہریوں میں تبدیل کر دیا۔ سر آرتھر برائنٹ (1984)، 'سیٹ اِن سلور سی: آ ہسٹری اف برٹن اینڈ برٹش پیپل'

کسی بھی نمائندے کو اپنے واضح خیالات کی براہ راست مخالفت کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے پارٹی آراء/موقف کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ (یہ) بندگی کا وہ درجہ ہے جس کا کوئی بھی عزت دار و خوددار آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایڈمنڈ برک (1741)، 'دی جنٹلمینز اینڈ لندن میگزین'

جمہوریت کے لیے دنیا کو لازماً محفوظ بنانا ہو گا۔ اس کے امن کی داغ بیل سیاسی آزادی کی آزمودہ بنیادوں پر رکھنی چاہیے۔ ووڈرو ولسن (1917)، 'ایڈریس ٹو کانگریس آن وار'

وضاحتیں اور جائزہ

بیتھم، ڈی (2005) ڈیموکریسی: آبگنرز گائیڈ۔ لندن: ون ورلڈ پبلی کیشنز۔ ایک سیدھا سا تعارف،

جمہوریت کی فعالیت کے لیے درکار اصولوں اور اداروں کی نشاندہی اور اس کا موازنہ کہ یہ حقیقت میں کیسے ارتقاپذیر ہوتی ہے۔ یہ کتاب ابھرتی ہوئی جمہوریتوں کے مسائل،عام طور پر سیاست سے مایوسی، اور شمولیتی متبادلات کی وضاحت کرتی ہے۔

بٹلر، ای (2012) پبلک چوائس: آ پرائمر۔ لندن: انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک افیئرز۔ ووٹرز، پریشر گروپس، سیاست دانوں اور عہدیداروں کے درمیان خودغرضی/ذاتی مفاد کے کردار کا سیدھا سیدھا گائیڈ، اور یہ کہ یہ کس طرح جمہوری فیصلوں کی کارکردگی اور معروضیت پر سوالیہ نشان ہے۔

بٹلر، ای (2013) فاؤنڈیشن آف اے فری سوسائٹی۔ لندن: انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک افیئرز۔ سماجی اور معاشی آزادی اور لبرل جمہوریت کو سہارا دینے والے رواداری، انصاف، جائیداد کے حقوق اور شہری مساوات جیسے اصولوں کی سادہ توضیح۔

کریک، بی (2003) ڈیموکریسی: اے ویری شارٹ انٹروڈکشن۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ پاپولزم، اچھی حکومت کے اداروں اور شہریت جیسے مسائل کی وضاحت کرنے سے پہلے قدیم یونانی تاریخ سے جمہوریت کا سراغ لگاتی ہے۔

کارٹلیج، پی (2018) ڈیموکریسی: اے لائف۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ قدیم یونان سے لے کر رومن ریپبلک، نشاۃ ثانیہ کے نظام، امریکی آئین سے لے کر آج کی لبرل جمہوریتوں تک جمہوریت کی جڑوں کا سراغ لگانے والی بڑی تاریخ—اور کس طرح ہر نظام اکثریت کے مقابلے میں حقوق کے مسئلے سے نبردآزما ہوا ہے۔

ویئل، اے (2007) ڈیموکریسی۔ لندن: پالگریو۔ قدرے نظریاتی اور فلسفیانہ لیکن جمہوریت کی نوعیت، اس کو درپیش چیلنجز اور اس کا اندازہ ہماری گہری اقدار کے حوالے سے کیسے کیا جا سکتا ہے، اس کے بارے میں کچھ اچھے سوالات اٹھاتی ہے۔

چیلنجز اور تنقید

ایکین سی اور بیر لز ایل (2017) ڈیمو کریسی فار رئیلسٹ۔ پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔ ووٹر کی جہالت، قبائلیت اور شارٹ ٹرم ازم (مختصر مدت) کے مسائل کا اچھا جائزہ۔ مصنفین طاقت کے ارتکاز کو روکنے کے لیے باقاعدہ اور متواتر انتخابات کرانے کے حق میں بیلٹ انیشیٹیو اور جو دیگر شمولیتی حل ہیں، ان کو مسترد کرتے ہیں۔

برینن، جے (2016) آگینسٹ ڈیمو کریسی۔ پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔ ایک فلسفی رائے دہندگان کے منظم تعصبات کی نشاندہی کرتا ہے، یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ شراکتی نظاموں کے ذریعے وہ ووٹروں میں سے (بعض کو باشعور یا) 'تعلیم یافتہ' نہیں بنا سکتے، بلکہ یہ انہیں بدتر بنا دیتے ہیں۔ اس کا استدلال ہے کہ جمہوریت پیچیدہ انتخاب یا فیصلے کو معمولی بناتی ہے، طاقت پر انحصار کرتی ہے، افراد کو دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے دیتی ہے اور اس طرح اجنبیوں کو دشمن بناتی ہے۔

کیپلن بی (2007) دی متھ آف دی ریشنل ووٹر۔ پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔ اس بات کی کلاسیکی وضاحت کہ کس طرح ووٹرز میں منظم تعصبات ہوتے ہیں خاص طور پر، مارکیٹ مخالف، غیر ملکی مخالف، 'میک ورک' (کسی کو محض مصروف رکھنے کی (اکثر) غیر اہم سرگرمی) اور مایوسی کے تعصبات ۔جو جمہوری نتائج کو مسخ کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ جمہوریت کیوں ناکام ہوتی ہے۔

کارسٹن ایف اور بیک مین کے (2012) سکاٹس ویلی، کری ایٹ سپیس۔ حریت پسندانہ نقطہ نظر سے منطقی اور سیدھی تنقید، یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ جمہوریت ایک اجتماعی خیال ہے جو اب بحران میں ہے۔ مصنفین مقبول حکمرانی، انصاف پسندی، آزادی، رواداری، وغیرہ افسانوی اقدار کی فہرست بناتے ہیں جو جمہوریت سے منسوب ہیں اور اس کے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ بشمول نوکر شاہی، فلاح اور شارٹ ٹرم ازم۔ وہ سادہ بنیادی قوانین کی حامل چھوٹی حکومتوں کے نئے خیال کی وکالت کرتے ہیں۔

آسٹروم وی (1997) دی مینِنگ آف ڈیمو کریسی اینڈ ولنر یبلٹی آف ڈیمو کریسی۔ یونیورسٹی آف

مشی گن پریس۔ جمہوری نظام کے پھلنے پھولنے کے لیے درکار سماجی اور ثقافتی حالات، اور طاقتور 'جمہوری' حکومتوں کے سامنے انفرادی آزادیوں اور سول سوسائٹی کے تحفظ میں مشکلات کی کھوج۔ مختلف براعظموں اور خاص طور پر کمیونزم سے ابھرنے والے ممالک میں جمہوری معاشروں کی تعمیر کی مشکلات کو بھی دریافت کرتی ہے۔

سمتھ سی اینڈ مائرس ٹی (2011) ڈیموکریسی اینڈ دی فال آف دی ویسٹ، ایکسیٹر: امپرنٹ اکیڈمک۔ یہ مختصر کتاب دلیل دیتی ہے کہ جمہوریت ایک نیا ظلم پیدا کر رہی ہے جو ان لبرل اقدار کو کمزور کرتی ہے جن پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے – جیسے قانون کی حکمرانی، رواداری، جائیداد کے حقوق، آزاد منڈی، سول سوسائٹی اور سماجی آزادی۔ سیاست دان کے نزدیک جمہوریت اپنے منصوبوں کے لیے طاقت کا ایک کارآمد ذریعہ ہے، یہ سوچ ایک دبنگ ریاست کا باعث بنتی ہے۔

سٹوکر جی (2007) وائی پالیٹکس میٹرز: میکنگ ڈیموکریسی ورک۔ نیویارک: پالگریو میکملن۔ یہ (کتاب) بتاتی ہے کہ سیاست جمہوریت کا ناگزیر حصہ ہے کیونکہ اجتماعی فیصلے ہر ایک کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ لیکن سیاست ایک ایسا 'پیشہ' بن گیا ہے جو عوام کو الگ تھلگ کر دیتا ہے۔ اور میڈیا کی جانب سے اس کی کوریج نے اسے گھٹیا بنا دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ احتساب، پارٹی کے اخراجات کی حد، شہریوں کے نمائندے کو پلٹانے/معزول کرنے کے اختیار اور زیادہ لوکل ازم پر زور دیتی ہے۔

دیگر حوالہ جات

آسیموگلو ڈی اینڈ رابنسن جی (2006) اکنامک اوریجنز آف ڈکٹیٹرشپ اینڈ ڈیموکریسی۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس۔

آسیموگلوڈی اینڈ رابنسن جی (2012) وائی نیشنز فیل۔ نیویارک: کراؤن پبلشنگ گروپ۔

ایڈمز، جے (1814) لیٹر ٹو جان ٹیلر (XVIII)۔ واشنگٹن، ڈی سی: نیشنل آرکائیوز (https://founders.archives.gov/documents/ Adams/99-02-02-6371)

ایلوس اے اینڈ میڈو کرافٹ جی (2014) ہائیکس سلپری سلوپ، مخلوط معیشت کا استحکام اور کرائے کی تلاش کی حرکیات۔ پولیٹیکل اسٹڈیز 62(4): 843–61۔

ارسطو (350 قبل مسیح) پالیٹکس۔

اٹلی، سی (1957) سپیچ ایٹ آکسفورڈ، 14 جون۔

برینن، جی اور بکانن، جے ایم (1980) دی پاور ٹو ٹیکس۔ اینالیٹک فاؤنڈیشنز آف افسکل کانسٹی ٹیوشن (مالیاتی آئین کی تجزیاتی بنیادیں)۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس۔

برک، ای. (1774) سپیچ ٹو دی الیکٹرز آف برسٹل (https://www.econlib.org/book-chapters/chapter-vol-4-miscellaneous-wri tings-speech-to-the-electors-of-bristol/)۔

برک، ای. (1790) ری فلیکشنز آن دی ریولشن اِن فرانس۔ لندن: جیمز ڈوڈزلی۔

بٹلر، ای (2015a) کلاسیکل لبرل ازم: اے پرائمر۔ لندن: انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک افیئرز۔

بٹلر، ای (2015b) میگنا کارٹا: اے پرائمر۔ لندن: ایڈم سمتھ انسٹی ٹیوٹ۔

اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ (2019) ڈیموکریسی انڈیکس 2019
(http://www.eiu.com/topic/democracy-index)۔

فورسٹر، ای ایم (1951) ٹو چیئرز فار ڈیموکریسی۔ نیویارک: ہارکورٹ، بریس اینڈ کمپنی۔

فوکویاما، ایف (1992) دی اینڈ آف ہسٹری اینڈ دی لاسٹ مین۔ نیویارک: فری پریس۔

ہائیک، ایف اے (1944) دی روڈ ٹو سرفڈم۔ لندن: روٹلیج۔

ہائیک، ایف اے (1979) لاء، لیجسلیشن اینڈ لبرٹی، والیوم 1. لندن: روٹلیج۔

ہائیک، ایف اے (1988) دی فاٹل کنسیٹ: دی ایررز آف سوشل ازم۔ لندن: روٹلیج۔

ہوبس ٹی (1651) لیویاتھن۔ لندن: اینڈریو کروک۔

ہیوم، ڈی (1758) ایسیز، مورل، پولیٹیکل اینڈ اور لٹرری. ایڈنبرا: الیگزینڈر کنکیڈ۔

کینیڈی، اے (1999) فرنٹ لائن انٹرویو: جسٹس فارسیل۔ پبلک براڈکاسٹنگ سسٹم۔

کیے ایم (2014) ڈونٹ ہرٹ پیپل اینڈ ڈونٹ ٹیک دیئر سٹف۔ نیویارک: ہارپر کولنز۔

لاسن آر، مرفی آر اینڈ پاول بی (2020) دی ڈٹرمینیشنز آف اکنامک فریڈم: اے سروے۔ کنٹمپریری اکنامک پالیسی 38 (4): 622–42۔

لیمکے جے ایس (2016) انٹرجورسڈکشنل کمپیٹیشن اینڈ دی میرڈ وومنز پراپرٹی ایکٹس۔ پبلک چوائس 166 (3): 291–313۔

لنکن اے (1863) گیٹسبرگ ایڈریس
(http://www.ourdocuments.gov/doc.php?doc=36&page=transcript)۔

لاک، جے (1689) اِن ٹو ٹریٹیز آف گورنمنٹ۔ لندن: اونشام چرچل۔

لکسمبرگ، آر۔ (1899) سوشل ریفارم آر ری ولوشن؟

https://www.marxists.org/archive/luxemburg/1900/reform-)
/revolution)۔

میکاؤلی این(1513)روم:انتونیو بلاڈوڈی آسو لا۔

میک فیئر سن، سی بی(1966) دی رئیل ورلڈ آف ڈیمو کریسی۔ آکسفورڈ: کلیرینڈن پریس۔

میٹسوساکا جے جی(2004) فاردی مینی آر دی فیو: دی انسٹیٹیوٹ، پبلک پالیسی اینڈ امریکن ڈیمو کریسی۔ شکاگو یونیورسٹی پریس۔

میننکن، ایچ ایل(1956) مائنارٹی رپورٹ۔ بالٹی مور: جانز ہاپکنز یونیورسٹی پریس۔

میسکیتا بی بی ڈی، سمتھ اے، سائیورسن آر ایم، مارو جے ڈی (2003) دی لاجک آف پولیٹیکل سروائیول، کیمبرج، ایم اے: ایم آئی ٹی پریس۔

مل، جے ایس(1861) کنسیڈریشنز آن ری پریزنٹیٹو گورنمنٹ۔ لندن: پارکر، سن، اینڈ بورن

مانٹیسکیو سی ایل (1748) دی سپرٹ آف دی لاز (https://oll.lib ertyfund.org/title/montesquieu-complete-works-vol-1-the-spirit-of-laws)۔

مرفی، آر(2018) گورننس اینڈ دی ڈائمنشنز آف آٹو کریسی۔ کانسٹی ٹیوشنل اکانومی 30: 131–48۔

اورویل، جی(1946) پالیٹکس اینڈ دی انگلش لینگوئج۔ ہورائزن 13 (76): 252–65۔

پیریکلز آف ایتھنز (431 بی سی) فنرل اوریشن۔ اِن دی ہسٹری آف دی پیلو پونیسئین وار۔

پوپر، کے آر(1945) دی اوپن سوسائٹی اینڈ اِٹس اینیمیز۔ لندن: روٹلیج۔

ریڈلے ایم(2020) ہاؤ انوویشن ورکس۔ لندن: فورتھ اسٹیٹ۔

رابسپئیرے ایم(1794) رپورٹس آن دی پرنسپلز آف پبلک موریلٹی۔ فلاڈیلفیا: بینجمن فرینکلن بیچ۔

شُمپیٹر، جے(1942) کیپیٹل ازم، سوشل ازم اینڈ ڈیمو کریسی۔ نیویارک: ہارپر اینڈ برادرز۔

ٹوکے ویلے اے ڈی (1835) ڈیمو کریسی اِن امریکہ۔ لندن: ساانڈرس اینڈ اوٹلی۔
ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل (2019) کرپشن پرسیپشن انڈیکس۔ برلن: ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل۔
وڈال جی۔ (1987) آرمیگیڈن لندن: گرافٹن۔

کلیدی اصطلاحات

آمریت

یونانی آٹوس (خود) اور کراتوس (طاقت) سے ماخوذ۔ حکومت کی ایک شکل جس میں ایک فرد (آمر) بغیر کسی قانونی یا انتخابی پابندی کے طاقت و اختیار استعمال کرتا ہے۔

بیلٹ انیشیٹیو

کوئی پالیسی اپنانے، مقننہ میں (کسی پالیسی یا ایشو پر) ووٹ ڈلوانے، یا ریفرنڈم کرانے کے لیے رائے دہندگان کے ایک گروپ کی طرف سے سامنے آنے والی ایک تجویز

آئین

کنونشن/اجتماع/ضابطے، قانون اور نظیر کا ایک ادارہ جو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حکومت کو کس طرح تشکیل دینا اور کس طرح کام کرنا ہے، اور اس میں شامل افراد کے اختیارات کی حدود کیا ہوں گی۔

آئینی حکومت

حکومت کی کوئی بھی شکل جس میں طاقت/اختیارات کو بنیادی قوانین، روایات یا تحریری ('مرموز') آئینوں کے ذریعے متعین اور محدود کیا جاتا ہے۔ ان میں آئینی بادشاہت شامل ہے جس میں ریاست کے سربراہ کا عہدہ ورثے میں ملتا ہے، آئینی جمہوریت جس میں اہل شہری حکمرانوں کا انتخاب اور ان سے جواب طلبی کر سکتے ہیں، اور آئینی امر شاہی/اشرافیہ کی حکومت جہاں اختیارات ایک خاص گروہ کے پاس ہوتے ہیں۔

جمہوریت

یونانی ڈیموس (لوگ) اور کراتوس (طاقت) سے ماخوذ۔ قدیم یونان میں حکومت کی وہ شکل جس میں

شہری ریاست کے اہل شہری قوانین اور پالیسیوں پر بحث اور فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ دورِ حاضر میں حکومت کی کوئی بھی شکل جس میں اہل شہری ایسے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں جو قوانین اور پالیسیوں پر بحث کرتے ہیں اور ان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

ڈکٹیٹر

لاطینی ڈکٹو (ڈکٹیٹ/حکم دینا) سے۔ کسی ملک کا مطلق قادر حکمران، عام طور پر وہ جس نے طاقت کے ذریعے کنٹرول حاصل کیا ہو۔

لبرل جمہوریت

جمہوریت کی ایک شکل جو اکثریت کی حکمرانی پر انفرادی حقوق اور آزادیوں کو ترجیح دیتی ہے۔ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات، اختیارات کی علیحدگی، رواداری اور قانون کی حکمرانی لبرل جمہوریت کی خصوصیات ہیں۔

امر شاہی/اشرافیہ کی حکمرانی

یونانی اولیگوس (چند) اور آرخو (حکمرانی) سے ماخوذ۔ حکومت کی ایک شکل جو ایک چھوٹے گروپ جیسے خاندان یا فوجی جنتا کے زیر کنٹرول ہے۔

ری کال

ایک طریقہ کار جس کی بدولت مقامی ووٹرز کو اپنے نمائندوں کو دفتر سے نکال باہر پھینکنے کیلئے عام انتخابات کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ریفرنڈم

کسی مسئلے پر کُل ووٹروں کی رائے شماری، عام طور پر حکومت کی طرف سے شروع کرائی جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ (پر عمل) مقننہ اور ایگزیکٹو کیلئے لازمی بھی ہو سکتا ہے، یا محض مشاورتی بھی۔

جمہوریہ

لاطینیres publica(لوگوں کی چیز) سے ماخوذ۔ حکومت کی ایک شکل جس میں اقتدار وراثت میں نہیں ملتا بلکہ عوام منتخب کر کے سونپتے ہیں یا منتخب نمائندے، اور کبھی کبھی 'اولیگاک' (امر شاہی کا کوئی رکن) یا آمر تقرری کرتے ہیں۔ جمہوریہ میں طاقت کو عام طور پر متفقہ کنونشنز (روایات) یا تحریری آئین کے ذریعے محدود کیا جاتا ہے۔ ریاست کا سربراہ عام طور پر صدر ہوتا ہے۔

اختیارات کی علیحدگی

ایک ایسا نظام جو حکومتی امور کو مختلف شاخوں جیسے انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں الگ کر کے طاقت کے ارتکاز کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔ عموماً قانون سازی کی طاقت کو مزید دو مختلف ایوانوں یا مقننہ کے چیمبروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

IEA کے بارے میں

یہ انسٹی ٹیوٹ ایک تحقیقی اور تعلیمی خیراتی **ادارہ** ہے (نمبر CC 235 351)، ضمانت کے ذریعے محدود ہے (مطلب کسی قانونی معاملے یا قرض کی صورت میں اس کے ڈائریکٹرز یا ارکان کی مالی ذمہ داری محدود ہے)۔ اس کا مشن معاشی اور سماجی مسائل کے حل میں مارکیٹوں کے کردار کا تجزیہ اور وضاحت کر کے آزاد معاشرے کے بنیادی اداروں کی تفہیم کو بہتر بنانا ہے۔

IEA اپنے مشن کو درج ذیل ذرائع کی مدد سے حاصل کرتا ہے:

- ایک اعلیٰ معیار کا اشاعتی پروگرام

کانفرنسز، سیمینارز، لیکچرز اور دیگر تقریبات

- اسکول اور کالج کے طلباء تک رسائی
- میڈیا پر تعارفی پروگرام اور پیش ہونے میں سہولت کاری کر کے

آئی ای اے، جسے 1955 میں آنجہانی سر انٹونی فشر نے قائم کیا تھا، ایک تعلیمی خیراتی ادارہ ہے، کوئی سیاسی تنظیم نہیں۔ اس کا کسی بھی سیاسی جماعت یا گروپ سے نہیں اور کسی بھی سیاسی جماعت یا امیدوار کی حمایت پر کسی الیکشن یا ریفرنڈم میں یا کسی اور وقت پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کی مالی اعانت مطبوعات کی فروخت، کانفرنس کی فیسوں اور رضاکارانہ عطیات سے کی جاتی ہے۔

اشاعتوں کی اپنی اہم سیریز کے علاوہ، IEA (بکنگھم یونیورسٹی کے ساتھ مشترکہ طور پر) 'اکنامک افیئرز' بھی شائع کرتا ہے۔

IEA کو اس کے کام میں ایک ممتاز بین الاقوامی اکیڈمک ایڈوائزری کونسل اور اعزازی فیلوز کا ایک نامور پینل مدد فراہم کرتا ہے۔ دیگر ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر وہ ممکنہ IEA اشاعتوں کا جائزہ لیتے ہیں، ان کے تبصرے گمنام طور پر مصنفین تک پہنچائے جاتے ہیں۔ لہذا تمام IEA پیپرز دیگر

معروف تعلیمی جرائد کی طرح اسی آزاد ریفرنگ پراسیس سے مشروط ہوتے ہیں۔

IEA کی مطبوعات کو دنیا بھر کے سکولوں اور یونیورسٹیوں کی کلاسوں میں پڑھایا، اور بطور کورس اپنایا جاتا ہے۔ یہ پوری دنیا میں فروخت ہوتی ہیں اور اکثر ان کو ترجمہ/دوبارہ پرنٹ کیا جاتا ہے۔

1974 سے IEA نے 70 سے زائد ممالک میں 100 ملتے جلتے اداروں کا عالمی نیٹ ورک بنانے میں مدد کی ہے۔ وہ سب آزاد لیکن IEA کے مشن میں شریک ہیں۔

IEA کی اشاعتوں میں بیان کئے گئے خیالات مصنفین کے ہیں، انسٹی ٹیوٹ (جس کا کوئی کارپوریٹ/کاروباری نظریہ نہیں ہے)، یا اس کی مینیجنگ ٹرسٹیز، اکیڈمک ایڈوائزری کونسل کے ممبران یا سینئر عملہ کے نہیں۔

انسٹی ٹیوٹ کی اکیڈمک ایڈوائزری کونسل کے ممبران، اعزازی فیلوز، ٹرسٹیز اور اسٹاف ذیل صفحہ پر درج ہیں۔

ادارہ اپنے اشاعتی پروگرام اور دیگر کاموں کے لیے فیاضانہ مالی تعاون پر مرحوم پروفیسر رونالڈ کوز کا شکر گزار ہے۔

لِنڈا ویٹسٹون

اکیڈمک ایڈوائزری کونسل

چیئرمین: پروفیسر مارٹن رکٹس

گراہم بینوک

ڈاکٹر راجر بیٹ

پروفیسر البیر ٹوبینیگا سلینچ، جونیئر

پروفیسر کرسچن بیورنسکو

پروفیسر ڈونلڈ جے بوڈرو

پروفیسر جان برٹن

پروفیسر فارسٹ کیپی

پروفیسر اسٹیون ایس چیونگ

پروفیسر ٹم کونگڈن

پروفیسر کرسٹوفر کوئن

پروفیسر این ایف آر کرافٹس

پروفیسر ڈیوڈ ڈی میزا

پروفیسر کیون کی ڈاوڈ

پروفیسر ڈیوڈ گرین آوے

ڈاکٹر انگرڈ اے گریگ

ڈاکٹر سیموئل گریگ

والٹر ای گرائنڈر

پروفیسر اسٹیو ایچ ہینک

پروفیسر کیتھ ہار ٹلے

پروفیسر پیٹر ایم جیکسن

ڈاکٹر جیری جارڈن

پروفیسر ٹیرنس کیلے

ڈاکٹر لین کیسلنگ

پروفیسر ڈینیل بی کلائن

ڈاکٹر مارک کویاما

پروفیسر چندرن کوکاتس

ڈاکٹر ٹم لیونگ

ڈاکٹر اینڈریو للیکو

پروفیسر اسٹیفن سٹیون لٹل چائلڈ

پروفیسر تھیوڈور روزویلٹ میلوک

ڈاکٹر ایلین مارشل

پروفیسر انٹونیو مارٹینو

ڈاکٹر جان میڈو کرافٹ

ڈاکٹر انجا میئرز

ڈاکٹر لوسی مینفورڈ

پروفیسر جولین مورس

پروفیسر ای ڈی آرمیڈ لٹن

ڈاکٹر ماری نیوہاؤس

پال اور میر وڈ

پروفیسر ڈیوڈ پارکر

ڈاکٹر نیما پروینی

پروفیسر وکٹوریا کرزن پرائس

ڈاکٹر الیکس روبسن

پروفیسر پاسکل سیلن

ڈاکٹر رزین سیلی

پروفیسر پیڈرو اسکوارٹز

پروفیسر جے آر شیکلٹن

جین ایس شا

پروفیسر ڈبلیو اسٹینلی سیبرٹ

شنکر سنگھم

ڈاکٹر کارلو اسٹیننیگ

پروفیسر جیمز ٹولی

ڈاکٹر ریڈ و میر ٹائلکوٹ

پروفیسر نکولا ٹائنن

پروفیسر رولینڈ وابل

ڈاکٹر سینٹو ویلجانوسکی

پروفیسر لارنس ایچ وائٹ

IEA کی طرف سے حال ہی میں شائع ہونے والی دیگر کتابوں میں شامل ہیں:

اِن فوکس: دی کیس فار پرائیویٹائزنگ دی بی بی سی

تدوین از فلپ بوتھ

ہوبارٹ پیپر بیک 182؛ آئی ایس بی این 7-36725-255-0-978؛ 12.50£

اسلامک فاؤنڈیشن آف اے فری سوسائٹی

تدوین: نوح ایل ہرموزی اور لنڈا ویٹسٹون

ہوبارٹ پیپر بیک 183؛ آئی ایس بی این 8-36728-255-0-978؛ 12.50£

دی اکنامکس آف انٹرنیشنل ڈوپلپمنٹ: فارن ایڈ ورسز فریڈم فار دی ورلڈز پوور

ولیم ایسٹرلی

ریڈنگز اِن پولیٹیکل اکانومی 6؛ آئی ایس بی این 8-36731-255-0-978؛ 7.50£

ٹیکسیشن، گورنمنٹ سپینڈنگ اینڈ اکنامک گروتھ

تدوین: فلپ

بوتھ ہوبارٹ پیپر بیک184; آئی ایس بی این978-0-255-36734-9; £15.00

یونیورسل ہیلتھ کیئر وِد آوٹ دی این ایچ ایس: ٹوورڈز اے پیشنٹ سنٹرڈ ہیلتھ سسٹم

کرسٹیان نیمیٹز

ہوبارٹ پیپر بیک185; آئی ایس بی این978-0-255-36737-0; £10.00

سی چینج: ہاؤ مارکیٹس اینڈ پراپرٹی رائٹس کڈ ٹرانسفارم دی فشنگ انڈسٹری

تدوین: رچرڈ ویلنگز

ریڈنگز اِن پولیٹیکل اکانومی 7; آئی ایس بی این978-0-255-36740-0; £10.00

ورکنگ ٹورول: دی ڈیمجنگ اکنامکس آف یو کے ایمپلائمنٹ ریگولیشن

جے آر شیکلٹن

ہوبارٹ پیپر بیک186; آئی ایس بی این978-0-255-36743-1; £15.00

ایجوکیشن، وار اینڈ پیس: دی سرپرائزنگ سکسیس آف پرائیویٹ سکولز اِن وار ٹارن کنٹریز

جیمز ٹولی اور ڈیوڈ لانگ فیلڈ

آئی ایس بی این978-0-255-36746-2; £10.00

کِلز جوائے: اے کریٹیک آف پیٹر نلزم

کرسٹوفر سنوڈن

آئی ایس بی این978-0-255-36749-3; £12.50

فنانشل سٹیبلٹی وِد آوٹ سنٹرل بینکس

جارج سیلگین، کیون ڈاوڈ اور میتھیو بیڈ ارڈ

آئی ایس بی این 978-0-255-36752-3; £10.00

آگینسٹ دی گرین: اِن سائنٹس فرام اکنامک کانٹریرین

پال اور مروڈ

آئی ایس بی این 978-0-255-36755-4; £15.00

این رینڈ: ایک تعارف

ایمن بٹلر

آئی ایس بی این 978-0-255-36764-6; £12.50

کیپیٹل ازم: ایک تعارف

ایمن بٹلر

آئی ایس بی این 978-0-255-36758-5; £12.50

آپٹنگ آؤٹ: کانشس اینڈ کوآپریشن اِن پلورلسٹک سوسائٹی

ڈیوڈ ایس اوڈربرگ

آئی ایس بی این 978-0-255-36761-5; £12.50

گیٹنگ دی میئرز آف منی: اے کریٹیکل اسیسمنٹ آف یوکے مانیٹری انڈیکیٹرز

انتھونی جے ایونز

آئی ایس بی این 978-0-255-36767-7; £12.50

سوشلزم: دی فیلڈ آئیڈیا دیٹ نیور ڈائز

کرسٹیان نیمیئٹز

آئی ایس بی این 978-0-255-36770-7; £17.50

ٹاپ ڈاگز اینڈ فیٹ کیٹس: اے ڈیبیٹ آن ہائی پے

تدوین: جے آر شیکلٹن

آئی ایس بی این 978-0-255-36773-8; £15.00

سکول چوائس آراؤنڈ دی ورلڈ ۔۔۔ اینڈ دی لیسنز وی کن لرن

تدوین: پولین ڈکسن اور اسٹیو ہمبل

آئی ایس بی این 978-0-255-36779-0; £15.00

سکول آف تھاٹ: 101 گریٹ لبرل تھنکرز

ایمن بٹلر

آئی ایس بی این 978-0-255-36776-9; £12.50

ریزنگ دی روف: ہاؤ ٹو سالو دی یونائیٹڈ کنگڈ مز ہاؤسنگ کرائسز

تدوین: جیکب ریس موگ اور راڈو میر ٹائلکوٹ

آئی ایس بی این 978-0-255-36782-0; £12.50

ہاؤ مینی لائٹ بلبز ڈز اِٹ ٹیک ٹو چیلنج دی ورلڈ؟

میٹ رڈلی اور اسٹیفن ڈیوس

آئی ایس بی این 978-0-255-36785-1; £10.00

دی ہنری فورڈز آف ہیلتھ کیئر: ۔۔۔ لیسنز دی ویسٹ کین لرن فرام دی ایسٹ

نیما سنند اجی

آئی ایس بی این 978-0-255-36788-2; £10.00

این انٹروڈکشن تو انٹرپرینیورشپ

ایمن بٹلر

آئی ایس بی این 978-0-255-36794-3; £12.50

IEA کی دیگر اشاعتیں

دیگر اشاعتوں کے بارے میں جامع معلومات اور IEA کے وسیع تر کام کو www.iea.org.uk پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی بھی اشاعت کا آرڈر دینے کے لیے براہ کرم نیچے دیکھیں۔

ذاتی صارفین

ذاتی صارفین کے آرڈرز IEA کو بھیجے جائیں:

کلیئرس برج

آئی ای اے

2 لارڈ نارتھ سٹریٹ

فری پوسٹ LON10168

لندن SW1P 3YZ

ٹیلی فون: 020 7799 8911، فیکس: 020 7799 2137

ای میل: @sales.uka

تجارتی صارفین بک ٹریڈ کے تمام آرڈرز IEA کے ڈسٹری بیوٹر کو بھیجے جائیں:

این بی این انٹرنیشنل (آئی ای اے آرڈرز)

آرڈرز ڈپارٹمنٹ

این بی این انٹرنیشنل

پلیمتھ PL6 7PP

ٹیلی فون: 01752 202301، فیکس: 01752 202333

ای میل: orders@nbninternational.com

IEA سبسکرپشنز

IEA اپنی اشاعتوں کے لیے سبسکرپشن سروس بھی پیش کرتا ہے۔ ایک ہی بار سالانہ ادائیگی کر کے (فی الحال برطانیہ میں £42.00) سبسکرائبرز IEA کا شائع کردہ ہر مونوگراف/ تحقیقی مقالہ وصول کر سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لیے برائے مہربانی رابطہ کریں:

کلیئر رس برج

سبسکرپشنز

آئی ای اے

2 لارڈ نارتھ سٹریٹ

فری پوسٹ LON10168

لندن SW1P 3YZ

ٹیلی فون: 020 7799 8911، فیکس: 020 7799 2137

ای میل: crusbridge@iea.org.uk

جمہوریت : اک تعارف

جمہوریت کیا ہے ؟ یہ کیسے کام کرتی ہے ؟ اس کی خوبیاں کیا ہیں اور اس کی خامیاں کیا ہیں ؟

دنیا کی دو تہائی آبادی، 100 سے زائد ممالک میں، ایسی حکومتوں کے تحت رہتی ہے جو جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے کچھ حکومتیں جمہوریت کے نظریات پر قائم رہتی ہیں، یا اس کے کلیدی اصولوں اور اداروں کا احترام کرتی ہیں۔

یہاں، مصنف ایمن بٹلر جمہوریت کی تعریف کرتے ہیں، اس کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہیں، اور حقیقی جمہوریت اور اس وقت موجود جمہوریت کی بہت سی جھوٹی قسموں کے درمیان فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔

وہ جمہوریت کی تاریخ اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں بہت سے روایتی قصوں کی نشاندہی بھی کرتے جو ہمیں اس کی حدود بارے اندھا کر دیتے ہیں۔

اور وہ بتاتے ہیں کہ جمہوریت کے بارے میں واضح تفہیم کیوں ضروری ہے۔۔۔ اور جب لوگ اسے صحیح طریقے سے نہیں سمجھیں گے تو اسے کتنی آسانی سے ضائع یا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ، وہ پوچھتے ہیں کہ آج کیوں بہت سارے لوگ جمہوری سیاست سے مایوس ہو چکے ہیں ۔ اور کچھ ممکن ہے، تو اس کے بارے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔

یہ واضح اور دلکش کتاب جمہوریت کا سیدھا سادہ تعارف فراہم کرتی ہے جو کسی کو بھی اسے (جمہوریت کو) سمجھنے کے قابل بناتی ہے چاہے اسے کبھی اس کا تجربہ ہوا ہی نہ ہو۔

ایمن بٹلر کی کتاب 'این انٹروڈکشن ٹو انٹراپرینئورشپ' www.iea.org.uk پر اور آن لائن ری ٹیلرز کے پاس بھی دستیاب ہے۔

'نیشنل انفلوونسرز' ایک خود مختار اور غیر جانبدار ادارہ ہے، جس کا بنیادی مقصد معاشی، سیاسی اور فکری تحریکوں کا بنیاد بننا، داخلی معاشی اور سیاسی مشکلات کا حل تلاشنا، قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانا اور آزاد معیشت کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادیوں اور حقوق کیلئے مثبت پالیسیوں کے مطالبات میں اضافہ کرنا ہے۔

'نیشنل انفلوونسرز' سود مند پالیسیوں کی پیشکش سمیت ہم فکر اور با اثر ساتھیوں، اساتذہ، طلباء، صحافیوں اور دانشوروں کے ذریعے عام لوگوں کے سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو مستقبل میں ایک آزاد، ذمہ دار، خوشحال اور ترقی یافتہ پاکستان کا سبب بنے۔

اس کتاب کے ترجمہ کرنے کا مقصد مقامی لوگوں کو جمہوریت کی تفہیم ،تاریخ اور اس کے مختلف ادوار پر مفصل بحث سمیٹنا اور لوگوں کو حقیقی جمہوری رویوں اور اقدار سے آگاہ کرنا ہے جو ایک خوشحال زندگی کیلئے نہ صرف ضروری ہیں، بلکہ ابھی تک بہت سے لوگ اس سے ناواقف ہیں۔

محمد سلیمان

صدر 'نیشنل انفلوونسرز'